

مفت لاہوری

تین غنڈے

افسانے

کرشن چمنہ

15/00

نیا ادارہ

تین غنڈے

کرشن چندر

تین غنڈے

نیا ادارہ — لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار سوم ۱۹۶۴

براہتمام: نذیر احمد چودھری
نقوش برلین میں چھپی

ترتیب

پال، ۹۰

غالیچہ، ۲۹

ایک اکسٹرالٹکی، ۵۷

پھانسی کے سائے، ۸۱

بھوت، ۹۹

تین غنڈے، ۱۱۷

پال

”پال!“

”یس ڈار لنگ!“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں تمہاری ڈار لنگ نہیں ہوں۔“

”تم ہو۔ میں نے جب کہہ دیا۔ بس۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا۔“

”میں یہ پہلے بھی سُن چکی ہوں۔“

”میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کئی بار۔ پیرس میں۔“

”بڑے سُر ہو تم۔“

”نہیں۔ میں سُر نہیں ہوں۔ میں آدین ہوں۔ تم بھی آدین ہو۔ ہم

پال

دونوں آئین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں فرانسیسی ہوں تم انگریز ہو۔ یہ ہندوستان ہے اور ہم دونوں آئین نسل کے افراد اس جنگل میں، اس صحرا میں، اس ویرانے میں، اس سمندر میں اکیلے ہیں۔ ایک جزیرے کی طرح۔

بتاؤ ہم کیوں محبت نہ کریں ڈور تھی..... ڈور تھی تمہارا نام عجیب سا ہے ڈور تھی، مجھے پسند نہیں ہے تمہارا نام ہونا چاہیے تھا۔ لی زل، ازابیلا، روز، وائنا، ہاں بس وائنا ٹھیک ہے۔ پیارا نام ہے، شرابی نام ہے مغربی فرانس کی بیلوں کی طرح لطافت ہے اس میں۔ وہ کیف، وہ بہار، وہ رعنائی..... وائنا.....!

”بڑی عجیب باتیں کرتے ہو تم، بڑی پیاری باتیں.....“

”تمہیں پسند ہیں نایہ باتیں۔ سبھی عورتیں مجھ سے یہی کہتی ہیں۔“

”سبھی عورتیں؟..... تو کیا تم — ہٹو، مجھے جانے دو۔ میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی!“

”نہیں ہٹو، انگریزی قوم بھی سچ مچ کس قدر عجیب ہے۔ محبت کے نام سے بدکتی ہے، محبت فرانسیسی کلچر کی جان ہے، اب اگر تمہاری جگہ کوئی فرانسیسی میڈموزیل ہوتی۔ تو جانتی ہو کیا کہتی.... اچھا جانے دو۔ ہٹو

یہ ہندوستان ہے اور ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور آج کی رات ہماری ہے۔
 ”آج کی رات؟ احمق، تم مجھے گھر پر پہنچا کے آؤ گے نا۔ پاپا انتظار
 کر رہے ہوں گے۔“

”شش..... پاپا کا نام نہ لو، آج کی رات ہماری ہے۔ یہ جینی
 رستوران ہے۔ جینی کھانا ہندوستان میں، اور ہندوستانی کھانا چین میں
 میں جب چینگ کنگ تھا۔ تو ایک ہندوستانی رستوران میں کھانا کھانے
 جایا کرتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔ انڈیا کافے.... انڈیا کافے..... لمٹے
 فرانسیسی کافے یاد آتے ہیں ہر روز۔ بار بار۔ ہر لمحے یاد آتے ہیں۔ یہ بھی
 کوئی کافے ہیں، نہ وہ نفاست ہے۔ نہ وہ نازکی، نہ وہ گفتار کا لہجہ۔ اپنی پیاری
 میٹھی زبان کو سننے کے لئے ترستا ہوں معاف کرنا، تمہاری انگریزی اس
 طرح بولی جاتی ہے۔ جس طرح پتھر ملی سڑک پر رولر چل رہا ہو۔“

”شٹ اپ“

”سچ کہتا ہوں اور سچ کو ہمیشہ شٹ اپ کہا جاتا ہے، ڈور تھی مجھے
 تم سے عشق ہے۔ مجھے فرانس سے عشق ہے۔ لیکن آج ہم دونوں اکیلے
 ہیں۔ بیرہ ایہ کھانا یہاں نیچے رکھ دو۔ نہیں اس میز پر نہ رکھو، کھانا پھر

کھائیں گے۔ خٹوری دیر کے بعد ہی۔ لیکن محبت نہیں رک سکتی۔ اک لمحے کے لئے نہیں۔ گھبراتا کیوں ہو۔ یہ بیرہ اتنی انگریزی نہیں سمجھتا۔“
 ”فرہن کر لو کہ یہ سمجھتا ہے تو۔“

”تو بھی کیا پروا ہے ہر روز یہ اس ٹیبل پر اسی قسم کی گفتگو سنتا ہے غالباً....“

”تم تو نرے غنڈے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں رستوران میں چلی آئی۔“

”تم یہ بات دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ یہ جھوٹ ہے۔ مگر ہے۔ دلفز دھوکا ہے میں اُسے خوب پہچانتا ہوں۔ سنو ڈور تھی۔ میں تمہیں دانا کھوگا تمہیں کوئی اعتراض ہے۔ تمہاری آنکھیں کسے دیتی ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ڈور تھی تو کوکیرول کا نام ہوتا ہے نا۔ سنو دانا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ اس سے پہلے بھی نہیں کئی انگریز مردوں نے یہ بتایا ہوگا۔ پر آج ایک فرانسیسی کی زبان سے سن لو تمہارا حسن بالکل نیا ہے۔ اس میں کنوارپتے کی تازگی ہے۔ مجھے تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں۔ بالکل منزل اور ان شفاف پتیلیوں کی گہرائیاں، اور یہ دلہانہ رنگت، جیسے زیتون میں شہد ملا ہو اور یہ بال، بلانڈ۔ صحرائی ریت کی

طرح تابناک، آہا ہا۔ کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے ان میں سے“
 ”ہٹو۔ مجھے نہ چھوؤ۔“

”کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے ان میں سے۔ اچھی۔ پیاری۔ ملکی۔ نیکیں جیسے
 بحرِ شمالی کی ہواؤں کی تازگی اور خنکی ان میں رچی ہوئی ہے۔ آہ۔۔۔۔۔
 اے انگریز عورت۔ تو نے کبھی کسی فرانسیسی سے محبت کی ہے۔ نہیں؟ تو
 تو نے زندگی میں محبت کی معراج کھودی ہے۔ مجھ سے عشق کر۔“
 ”سچ مچ بڑے باتونی ہو۔ شاید اسی لیے مجھے کچھ پسند ہو۔“
 ”ہاں۔ اب ایٹس راہِ راست پر، ہر عورت پہلے بھٹک جاتی ہے
 پھر راہِ راست پر آجاتی ہے، کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔“
 ”تمہارا تجربہ؟ اُف۔ کس قدر بے حیا ہو تم۔“

”سچی بات کہتا ہوں۔ اُس ملک کا بیٹا ہوں جس نے انقلاب کی
 پہلی موج کو جنم دیا۔ سچی بات کہتا ہوں وائٹا، تم مجھے پسند کرتی ہو میں
 تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اور ہم دونوں اکیلے ہیں اور یہ ہندوستان ہے اور
 آج جنگ ہے۔ اور موت کا طبل بج رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میں کل مر
 جاؤں، تم پونا سے تبدیل ہو کر اسکندر آباد چلی جاؤ یا منگھیرا کوئی اسی قسم

پال

کا ذلیل مقام، پھر آج یہ جو اتفاق سے ہم تم دونوں اکٹھے ہوئے ہیں۔ پھر کب مل سکیں گے۔ میں اسے معجزہ نہیں کہتا۔ اتفاق کہتا ہوں لاکھوں لاکھوں لاکھوں لاکھوں گردشوں کے درمیان دو ذرے ٹکرائے ہیں اور تم..... اُداس لمحے کو مل کر لیں۔ میں پونا ہوٹل میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک کمرہ ہے۔ اور چاروں طرف خاموشی ہے۔ زندگی سو رہی ہے۔ کھڑکی میں گلاب کی بیلیں ہیں۔ دو بڑے بڑے پھول، دو پاکیزہ آنسوؤں کی طرح تمہارے بالوں میں جگمگاتے نظر آئیں گے۔ اُہ ڈارلنگ!“

”بھئی مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے“

”تو آؤ کھانا کھائیں۔ مادی باتوں کا ذکر کرو گی۔ انگریز عورت جو ٹھہریں فرانسیسی ہمیشہ محبت کو ترجیح دیتا ہے، انگریز کھانے کو ریمان کرنا ڈارلنگ یہ مادیت تمہارے سراج کی بنیاد ہے۔ جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ کہو اس ملک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“

”میں نے دیکھا ہی نہیں اسے ابھی تک، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس میں بدبو بہت ہے۔“

”بدبو؟ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ ملک بدبوؤں سے بھرا ہوا ہے

پال

اور ہم تم دونوں اکیلے ہیں۔ دو پاک و صاف سفید آریں نسل کے فرد۔ آؤ
بھول جائیں۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ”چُچ.... چُچ....“
”کوئی دیکھ لے گا۔ کوئی سن لے گا۔“

”چُچ.... چُچ....“

”..... روٹی.....“

”گٹ آؤٹ بیرو.....“

”پال“

”ہاں پیارے“

”ان سے طو۔ یہ آخر ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شاعر، یہ جاوید
ہیں ہندوستان کے بہت بڑے ایکٹر۔ یہ دیاس ہیں۔ ہندوستان کے بہت
بڑے کوی، یہ اننت ہیں، ہندوستان کے بہت بڑے شکاری!“
”اور اس کمرے میں لڑکی ایک بھی نہیں۔ تم لوگ۔ ہندوستان کے
بڑے لوگ عورت کے بغیر زندگی کس طرح بسر کرتے ہو۔“
”ہم میں سے کوئی شخص بھی عورت کے بغیر زندگی بسر نہیں کرتا۔ ہم لوگ

پال

بیوی بچوں والے ہیں۔ ماں بہنوں والے ہیں، عشق بھی کرتے ہیں، دشتا میں بھی رکھتے ہیں۔“

”مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ معاف کرنا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر ہندوستانی نے اپنی عورت کو خواہ گاہ کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے، مجھے گھٹن سی محسوس ہوتی ہے یہاں، اک عجیب بیکلی۔ خلا میں مجھے ہر طرف پردے اور دیواریں نظر آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ اچھا کیا بتاؤں کیا جی چاہتا ہے۔ سن کر کیا کرو گے۔ میں پردہ پس ہوں۔ تم ہندوستانی ہو۔ میں گودا ہوں۔ تم کالے ہو۔ مجھ سے نفرت کرتے ہو گے اپنے دل میں۔ ہر یورپین سے تمہیں نفرت ہوگی۔ میری باتوں پر تمہیں کیونکر اعتبار آئے گا؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے پال۔ ہمیں کسی فرد سے نفرت نہیں۔ ہم تو اسی نظام زندگی سے نفرت کرتے ہیں، جو ہمارے اور تمہارے درمیان نفرت کا بیج بوتا ہے۔“

”کتابی باتیں نہ کہو زندگی کی زبان میں بات کرو۔ معاف کرنا۔ یہ کہو یہ لوگ، یہ فرنیچر، تمہاری روحانی غربت اور ذہنی افلاس کا آئینہ دار ہے۔ کیا اس طرح رہتے ہیں۔ مہذب لوگ۔ یہ بعد سے پھول بیوں والی ری۔ یہ بڑا

پال

آئینہ، یہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی، یہ صوفے جو اب نیلورپی ہیں۔
 نہ ایشیائی، یہ کونسی تہذیب ہے۔ کونسا کلچر ہے، کس مسرت کی
 آئینہ داری کرتی ہے۔ ذرا بتادو۔ ہم تم اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اس
 کمرے کی شخصیت کیا ہے؟

”شش۔ سنبھل کر بات کرو۔ ہوش میں آؤ پال۔ یہ کمرہ اختر کی محبوبہ

کا ہے“

”اختر کی محبوبہ کا ہے؟ ہاٹے غریبی۔ معاف کرنا شاعر۔ تم شاعر ہو۔
 تمہارا دل شاعر کا ہو گا لیکن اس کمرے کی روح اس قدر غریب کیوں ہے،
 یہ ویران دیواریں، بے نگے آئینے، یہ بے ڈول صوفے....“

”کراہ پر اٹھا لایا ہوں....“

نیت
 ”محبت کراٹے سے نہیں خریدی جاتی، یہ محبت نہیں ہے جیوا
 ہے، جاننے ہو اگر یہ کمرہ میری محبوبہ کا ہوتا تو میں کیا کرتا۔ میں اس کمرے کی
 ہر دیوار کو چینیسی کے پھولوں سے ڈھانپ دیتا۔ چینیسی کے نازک پھول جیسے
 فرانس کی کنواری.... یا سمن.... تمہارے ملک میں یا سمن کی اس قدر
 بتات ہے۔ اور پھر بھی یہ دیواریں نکلی ہیں۔ یہ آئینہ نکلا ہے۔ یہاں پر کوئی

پال

دیوان نہیں۔ کوئی غالیچ نہیں۔ ہوا میں تعطر نہیں۔ برآمدے میں پھولوں کی بلیں نہیں۔ دروازوں پر چنبیلی کے پرے کیوں نہیں۔ یہ لوہے کی سلاخیں یہاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ تمھارے محبوب کا مکہ ہے یا جیل خانہ۔ پیارے اختر۔ شاعر۔ بتاؤ۔ تم کس کلچر کی اولاد ہو۔ تم کیا نفیے۔ کیا ہو گئے۔ کہہ جا رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس یہ جانتا ہوں۔ تم اپنے افلاس۔ اپنی غلامی۔ اپنی مصیبتوں کے خود ذمہ دار ہو۔ معاف کرنا۔ میں سامراج کا حامی نہیں میں ڈیموکریسی کا سپاہی ہوں۔ کیا تم مجھ میں کسی قسم کی مغائرت کی جھلک دیکھتے ہو“

”نہیں“

”تو بس جو میں کہتا ہوں اسے ٹھیک سمجھو۔ ہا ہا ہا اچائے پلاؤ گے۔“

”ضرور۔۔۔۔۔ مگر ایک بات کہوں پال۔ تم حب بات کرتے ہو تو تمھارا نچلا ہونٹ بڑے عجیب انداز میں آگے کو پھیل جاتا ہے۔“

”مورس شولٹیر کی طرح“

”ہر فرانسیسی میری طرح دکش انداز میں اسی دکش انداز میں باتیں کرتا ہے۔ یہ ہماری قومی خصلت ہے۔ چارلس بویاں کو فلموں میں کام کرتے

پال

دیکھا ہوگا۔ آہ چارلس بویاں فرانسیسی اندازِ محبت کی تفسیر ہے۔ انگریز جب عشق کرتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں“۔ کس قدر پوچھ انداز ہے یہ۔ ”میں تم سے محبت کر رہا“۔ ”تم کس قدر حسین ہو“۔ یہ عاشق کی زبان نہیں ہے۔ بیکری کے مستری کی زبان ہے۔ جب فرانسیسی عشق کرتا ہے۔ تو خوشبوؤں کی زبان میں اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ یا سمن....
... یا سمن.... ”اختر۔ اس کمرے کو چنبیلی کے پھولوں سے رشک گلزار بنادو۔ تاکہ جب تمہاری محبوبہ اٹھلائی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو تو تم انکھوں کی زبان میں خوشبوؤں کے سانسوں میں اس سے اظہارِ محبت کر سکو“

پال۔ میں چارلس بویاں کا وہ فقرہ کبھی نہیں بھولتا جو اُس نے اپنی محبوبہ کی تعریف میں کہا تھا۔ ایک سادہ سا فقرہ ہے۔ لیکن اس سے بہتر جملہ محبت کی زبان میں آج تک ادا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ تم۔ تم میری محبوبہ نہیں ہو۔ تم پیرس ہو۔
”پیرس..... پدی..... پدی..... ہائے..... ہائے.....“

اس جملے پر سو جان سے نثار ہوں.... اختر تم اپنی محبوبہ سے کیا کہتے ہو بھلا؟“

پال

”میں؟ — میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس خاموش بیٹھا اُسے
تکٹا رہتا ہوں۔“

”یہ ایشیا کی زبان ہے۔ محرومیت کی زبان ہے۔ غریب غلام
اور گھٹے ہوئے لوگوں کی زبان ہے۔ پیالے محبت کرنا سیکھو۔ تم خود بخود
آزاد ہو جاؤ گے۔ سچ کہتا ہوں۔ یہ چائے بُری نہیں۔ لیکن پیالہ ٹوٹا ہوا
ہے۔ تم لوگوں کا دل بُرا نہیں۔ لیکن یہ غول۔ یہ ماحول۔ یہ جسم اسے بدلنے کی
ضرورت ہے۔ میں رنگ کا ذکر نہیں کر رہا۔ فرانسیسی قوم سفید رنگ کی
قوموں میں پہلی قوم ہے جو حبشی کے رنگ سے پیار کرتی ہے۔ ہم لوگ
دیوارِ رنگ میں یقین نہیں رکھتے۔ درحالیکہ امریکنوں کے ہاں بھی یہ دیوار
موجود ہے۔ مین فرانسیسی ہوں۔ ڈبجو کر لسی کا سچا سپاہی..... اچھا
تو یہ بتاؤ۔ تمہیں یورپین عورتیں پسند ہیں۔ کیوں شاعر..... تم سے تو
پوچھنا بیکار ہے، اپنی محبوبہ.....“

”نہیں۔ اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ سفید رنگ کی عورتیں پسند تو ہیں۔“
”اور تم جاؤید؟“

”اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا نا صاف.... جسم سے بدبو آتی ہے۔“

پال

ویسے بڑی صحت مند ہوتی ہیں۔“

”اور تم شکاری۔ اچھا یہ بتاؤ۔ فلم ایکٹرسوں میں تمہیں کونسی پسند ہے۔“
”انگریز برکین“

سکندے نیوین ٹائپ ہے۔ یعنی بالکل تمھاری ضد۔ آدمی تضاد کو اتنا
کیوں پسند کرتا ہے، شاید یہ برقی قوت انسان کے اندر بھی کار فرما ہے۔
شاید یہ محبت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثبت اور منفی قوت کی لہریں
اُن کا تصادم۔ محبت..... چہ خوب..... ٹھیک تو ہے۔ مجھے دکھیو
میں سفید رنگ کی عورت کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور انگریز عورت تو اس
قدر بھدی ہے۔ کہ بالکل نظر سے اتر چکی ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت سے
پیار ہے عشق ہے۔ والہانہ محبت ہے۔ میں ہر ہندوستانی عورت سے
پیار کرتا ہوں۔ ہر ایک سے۔ مجھے ان کا رنگ پسند ہے۔ ان کے بال
پسند ہیں۔ اُن کی چال پسند ہے، اُن کی مہنسی پسند ہے۔ اُن کی شفقت
پسند ہے۔ اُن کی مامتا۔ اُن کی حیا، اُن کی سمجھ..... اُن کی مظلومیت...
.... یہ یورپی عورت تو بجز اِٹری بد صورت ہے۔ پوڈر اور فائزے میں
پہلی مٹی، گندی اور اس کا سایہ اور ٹانگیں ننگی۔ اور نیلی نیلی رگیں۔ اور

پال

چتلے داغ..... اُف کس قدر گھناؤنا منظر ہے..... کہاں وہ دلفریب
ساریلوں کا ہواؤ جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی ریت پر..... وہ قم قم کا
ٹیکہ..... شاید میں بھی تمہاری طرح اپنی ضد کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے
ہندوستان میں صرف اندھرا کی عورتیں پسند ہیں، میں تو کسی ہندوستانی عورت
سے شادی کروں گا۔“

”جھوٹ بولتے ہو پال۔ تم کسی فرانسیسی کنواری۔ کسی گیسکاں لڑکی
سے شادی کرو گے اور جنگ کے بعد فرانسیسی شراب کی تجارت کرو گے۔
ہندوستان میں بھلا تم کیا رہو گے۔“

”یہ سچ ہے۔ میں فرانس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میں۔۔۔ میں ہندوستان
کی ایک دیوی کو فرانس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرا ملک
اس کا استقبال کرے گا۔ میرا خیال ہے میرے ماں باپ اُسے پسند
کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ میں ہندوستان
کی روح کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے ہندوستانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا
ہوں۔ اُس کے لیے میں ایک چھوٹا سا مندر بنواؤں گا فرانس میں۔ یہ
فرانس اور ہندوستان کی شادی ہوگی۔“

پال

”وہ شادی جو ڈوپلے اور لالی اور نہولیں نہ کر اسکا.....!“
 ”تم بھرتے ہو پیالے میں وہ فرانسیسی نہیں ہوں۔ میں روسو اور
 والتیر کا فرانس ہوں۔ میں سامراجی نہیں ہوں۔ میں ڈیموکریسی کا سپاہی
 ہوں۔ آؤ چلو، کہیں چل کر تھوڑی سی شراب پیئیں۔ اور کسی ہندوستانی
 لڑکی کا ناچ دیکھیں۔ مجھے ہندوستانی بار بار بہت پسند ہیں۔ اور وہ
 سُرخ سُرخ پرٹے جن کے اندر وہ ہندوستانی لڑکیاں ناچتی ہیں...
 جھی جھم چھم چھم ہا ہا ہا!“

”پال“

”ہم“

”یہ لکیر کے بالے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“
 ”بہت اچھا فلم ڈائریکٹر ہے۔ فرانس کا بہترین ہدایت کار۔ جسے
 ہالی وڈ نے تباہ کر دیا یہی ہوتا ہے، جب کوئی فرانسیسی اپنے ملک سے
 باہر جاتا ہے۔ وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ قوم اسی طرح تباہ ہوئی ہے تمہیں
 معلوم ہے۔ میں لینے لکیر کا اسٹنٹ رہ چکا ہوں۔“

پال

”نہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔“

”اُس کے لیے میں ایک کہانی بھی لکھ رہا تھا۔ پھر جنگ سرپراگئی۔
اور سب کچھ رہ گیا۔“

”اُس کہانی میں کیا تھا۔“

”ماں اور بیٹی دونوں کو ایک ہی آدمی سے عشق ہے اور یہ آدمی
اُس کی ماں کا ناجائز خاوند ہے یعنی اس بیٹی کا باپ۔“
”بہت خوب۔ پھر کیا ہوتا ہے۔“

”دیکھو۔۔۔ مگر یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ آخر میں یہ ہوتا ہے کہ بیٹی
اور باپ خاوند اور بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ شادی نہیں ہو سکتی مگر
اس سے کیا ہوتا ہے۔ محبت زوال ہے۔۔۔ بیڑہ! دو لارچ و سکی لاؤ۔۔۔۔۔“

”پال! تم آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے۔“

”ایک بات ہے تمہیں بتانا چاہتا تھا، مگر میں نے سوچا چوتھے
پریک کے بعد بتاؤں گا۔“

”کہو۔“

”میں کل صبح ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں فرینچ سیر پا

پال

جار رہا ہوں “

”اس میں خوشی کی کیا بات ہے“

”یہی کہ میں فرینچ سیریا جارہا ہوں۔ ہندوستان چھوڑ رہا ہوں۔ وہاں سے بکیرہ روم کا منظر شروع ہوتا ہے۔ پیرس دو قدم پر ہے اور پھر سچ پوچھو تو وہ فرینچ سیریا ہے۔ اپنا ملک ہے“

”پال وہ تمہارا ملک کس طرح ہے“

”کیا کہتے ہو تم۔“

”غور کرو۔ فرینچ سیریا تمہیں ان لفظوں میں کچھ دکھائی دیتا ہے۔ باہر سے مت پڑھو ان لفظوں کو۔ انہیں اندر سے پڑھو پال۔ فرینچ سیریا.... فرینچ کیوں تمہیں اس میں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے۔ فرینچ سیریا برٹش انڈیا، ڈچ بورنیو، تمہیں ان خوش رنگ، چمکتے ہوئے الفاظ کے پردے میں کہیں تاریکی کی جھلک نظر آتی ہے؟“

”لوو کی پیو....“

”پال تم کل جا رہے ہو میں بہت خوش ہوں۔ تم ایک ذہین فرانسیسی ہو۔ تم یورپ کے کلچر۔ تہذیب اور مذہب کا بہترین آئینہ ہو۔ شراب پیو،

پال

دوست تم کل فریج سیریا جا رہے ہو۔ تاریخ کا یہ تو اتر ڈیڑھ دو سو برس سے چلا آ رہا ہے۔ ڈیڑھ دو سو برس کیا ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ دو دن ڈیڑھ دو لمحے، کچھ بھی نہیں دوست۔ پھر اگر کل کو یہ تو اتر بدل جائے۔ اور کوئی سبب ہی تم سے کہے میں جینی فرانس۔ ہندی برطانیہ اور حبشی اطالیہ میں جا رہا ہوں۔ تو تمہیں خوشی حاصل ہوگی؟

”بہت پی گئے ہو شاید پی کر تمہارا احساس کتری بولنے لگتا ہے“
 ”احساس کتری نہیں۔ احساس بڑتری بول رہا ہے۔ آج معلوم ہوا تم کتنے چھپوے ہو۔ تمہاری تہذیب وقتی ہے۔ تمہاری خوشی وقتی ہے تمہاری فوقیت وقتی ہے دوست تم مر چکے ہو۔ کیونکہ تم نے اپنے دل میں نا انصافی اور ظلم اور بے رحمی کو جگہ دی ہے۔ ذلیل ہندوستانی!.....
 پال مجھے گھونسا مت دکھاؤ، اُسے اُس ہندوستانی عورت کے لیے سنبھال کر رکھو۔ جس کے لیے تم فرانس میں مندر بنائے تھے۔ وہ مندر کب کا مسمار ہو چکا۔ وہ مندر جس میں روسو اور والٹیر کی روح نے جنم لیا تھا۔ میں ذلیل ہوں لیکن زندہ ہوں۔ تم ارفع ہو لیکن مر چکے ہو۔ اور مجھے مردوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ جاؤ فریج سیریا جاؤ، یا ڈچ انسریقہ،

تیسری جنگِ عظیم تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے۔ اُسی طرح وقتی صلح کے بعد پھر جنگ آئے گی۔ کیونکہ پال تم ابھی تک نفرت کے قبرستان میں سو رہے ہو۔ مجھے روکو نہیں... مجھے بولنے دو۔ آج میری باری ہے اور تم فریج سیریا جا رہے ہو اور ہم دونوں وکی پی ہے ہیں، ایک زندہ ایک مردہ۔ ایک ذلیل، ایک بے رحم، بٹھراؤ پال.... یہاں سے اٹھ کر کہاں جا رہے ہو.... اپنے دوست کا آخری سلام تو لیتے جاؤ..... سنو میں اکیلا نہیں ہوں پال، میں چالیس کروڑ ہوں.... میں نفرت نہیں ہوں میں محبت ہوں۔ میں نیولین نہیں ہوں۔ میں اشوک ہوں۔ میں اکبر ہوں۔ میں گوتم ہوں چشتی ہوں۔ کبیر ہوں۔ کبیر کا نام سنا ہے تم نے؟ سنتے جاؤ پال، میں اجنتا ہوں۔ ایلورا ہوں۔ میں تاج محل ہوں..... میں محبت ہوں۔ عشق و انسانیت کی تفسیر ہوں، تم آزاد ہو کر بھی محبت نہیں کر سکتے۔ میں غلام رہ کر بھی تم سے محبت کرتا ہوں، میرا گھر بڑا ہے۔ میرا دل بڑا ہے، میری روح عظیم ہے..... بٹھراؤ پال۔ یہ چنبیلی کے پھولوں کا مار لیتے جاؤ۔ ایک ذلیل ملک کا آخری تحفہ..... سنو..... سنو پال! پال!

پال

ہیں تمہیں اُس تیسری جنگِ عظیم سے بچانا چاہتا ہوں۔ سنو پال۔ مجھے تم سے
نفرت نہیں ہے..... مجھے تم سے نفرت نہیں ہے.....!“

غالیچہ

اب تو یہ غالیچہ پرانا ہو چکا، لیکن آج سے دو سال پہلے جب میں نے اسے حضرت گنج میں ایک دکان سے خریدا تھا اس وقت یہ غالیچہ بالکل معصوم تھا، اس کی جلد معصوم تھی، اس کی مسکراہٹ معصوم تھی، اس کا ہر رنگ معصوم تھا، اب نہیں، دو سال پہلے، اب تو اس میں زہر گھل گیا ہے، اس کا ایک ایک تار مسموم اور متعفن ہو چکا ہے، رنگ ماند پڑ گیا ہے، تبسم میں آنسوؤں کی جھلک ہے، اور جلد میں کسی آتشک زدہ مریض کی طرح جا بجا گڑھے ٹپکے ہیں، پہلے یہ غالیچہ معصوم تھا اب قنوطی ہے، زہر خند ہنسی مہنتا ہے، اور اس طرح سانس لیتا ہے، جیسے کائنات کا سارا کوڑا کرکٹ اس نے اپنے

سیٹنے میں چھپا لیا ہو۔

اس غالیچے کا قد نو فٹ ہے، چوڑائی میں پانچ فٹ، بس جتنی ایک اوسط درجے کے پلنگ کی چوڑائی ہوتی ہے، کنا راچو کو ربادامی ہے اور ڈیڑھ انچ تک گہرا ہے، اس کے بعد اصل غالیچہ شروع ہوتا ہے، اور گہرے سرخ رنگ سے شروع ہوتا ہے، یہ رنگ غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے، اور دو فٹ کی لمبائی میں ہے، گویا 5×2 فٹ کی مستطیل، سرخ رنگ کی ایک جھیل بن گئی ہے، لیکن اس جھیل میں بھی سرخ رنگ کی جھلیاں، کئی رنگوں کے تماشے دکھائی ہیں، گہرا سرخ، گلابی، ہلکا قرمزی، اور سرخ جیسے گندہ خون ہوتا ہے، لیٹتے وقت غالیچے کے اس حصے پر میں ہمیشہ اپنا سر رکھتا ہوں، اور مجھے ہر بار یہ احساس ہوتا ہے، کہ میرے سر میں جو نکلیں لگی ہیں۔ اور میرا گندہ خون چوس رہی ہیں۔

پھر اس خونی مستطیل کے نیچے پانچ اور مستطیلیں ہیں، جن کے الگ الگ رنگ ہیں۔ یہ مستطیلیں غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلی ہوئی ہیں، اس طرح کہ آخری مستطیل پر غالیچے کی لمبائی بھی ختم ہو جاتی ہے، اور درمی کی کد شروع ہوتی ہے،..... خونی مستطیل کے بالکل نیچے تین چھوٹی چھوٹی

غالیچہ

مستطیل میں، پہلی سپید اور سیاہ رنگ کی شطرنجی ہے۔ دوسری سپید اور نیلے رنگ کی، تیسری بلو بلیک اور سیاہ کی، یہ شطرنجیاں دور سے بالکل چمپک کے داغوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں، اور قریب سے دیکھنے پر بھی ان کے حسن میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیلام شدہ پرانے گرم کوٹوں کی جلد کی طرح میلی میلی اور بد نما نظر آتی ہیں۔ پہلی مستطیل اگر خون کی جھیل ہے، تو پرتین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں مجموعی طور پر پیپ کی جھیل کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ان کے سپید، کالے، پیلے، بلو بلیک رنگ پیپ کی جھیل میں گڈ مڈ ہوتے نظر آتے ہیں، اس جھیل میں میرے شانے، میرا دل، اور میرے پھیمپڑے پلسیوں کے کس میں دھرے پڑتے ہیں۔

چوتھی مستطیل کا رنگ پیلا ہے، اور پانچویں کا سبز ہے، لیکن ایسا سبز ہے جیسے گہرے سمندر کا ہوتا ہے، ایسا سبز نہیں جس طرح موسم بہار کا ہوتا ہے۔ یہ ایک خطرناک رنگ ہے، اسے دیکھ کر شارک مچھلیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ڈوبتے ہوئے جہاز رانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، اور اُچھلتی ہوئی طوفانی، دیو ہیکل لہروں کی گونج اور گرج و عرشہ پیدا کرتی ہے اور پیلا ٹیلا رنگ تو منحوس ہی۔ یہ رنگ زعفران کی طرح، بسنت کی طرح پیلا نہیں۔

غالیچہ

یہ رنگ مٹی کی طرح پیلا ہے، تپتے سُریش کی طرح پیلا ہے، پہلے گنا کی طرح زرد ہے، ایک ایسا زرد رنگ جس میں شاید اک ہلکا سا احساس ندامت بھی شامل ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مستطیل بار بار کہہ رہی ہو۔ میں کیوں ہوں، میں کیوں ہوں.....!

جہاں میں اپنا احساس رکھتا ہوں، اُس کے دائیں کونے میں نیلے اور پیلے رنگ کے دس خطوط وحدانی بنے ہوئے ہیں، اور جہاں میں اپنے پاؤں پسار کے سوتا ہوں، وہاں گیارہ خطوط وحدانی ہیں۔ یہ پیلے اور فیروزہ رنگ کے ہیں، غالیچے کے وسط میں چھ خطوط وحدانی سرخ و سپید رنگ میں ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گہرا سیاہ نقطہ ہے..... جب میں غالیچے پر لیٹ جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سر سے پاؤں تک کسی نے مجھے ان خطوط وحدانی کی ہکوں میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے صلیب پر لٹکا کر میرے دل میں ایک گہرے سیاہ رنگ کی میخ ٹھونک دی ہے چاروں طرف گندہ خون ہے، پیپ ہے، اور سبز رنگ کا سمندر ہے جو شارک مچھلیوں اور سمندری ہزار پاؤں سے معمور ہے، شاید مسیح کو بھی صلیب پر اتنی ایذا نہ پہنچی ہوگی، جتنی مجھے اس غالیچے پر لیٹتے وقت حاصل

غالیچہ

ہوتی ہے، لیکن ایذا پرستی تو انسان کا شیوہ ہے، اسی لیے تو یہ غالیچہ میں اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ نہ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی اور غالیچہ خریدنے کی جرأت ہوتی ہے، میرے پاس ہی ایک غالیچہ ہے اور میرا خیال ہے کہ مرتے دم تک یہی ایک غالیچہ رہے گا۔

اس غالیچے کو دراصل ایک خاتون خریدنا چاہتی تھی، حضرت گنج میں ایک دکان کے اندر وہ اسے کھلوا کر دیکھ رہی تھی، کہ میری نگاہوں نے اسے پسند کر لیا، اور وہ خاتون کچھ فیصلہ نہ کر سکی اور اسے وہیں چھوڑ کر اپنے بلاؤز کے لیے ریشمی کپڑے دیکھنے لگی۔

میں نے منہج سے کہا: ”یہ غالیچہ میں خریدنا چاہتا ہوں!“
وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ”مس روپ وقتی — شاید
— اسے پسند کر چکی ہیں۔ شاید ا — — — ٹھہریے۔ میں اُن سے پوچھتا
ہوں۔“

روپ وقتی بولی: ”غالیچہ — بُرا نہیں!“
دُبرا نہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں نے مجھڑک کر کہا: ”ایسا
غالیچہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہوگا۔ دانستے کے تخیل نے بھی ایسا ناسخ

غالیچہ

تیار نہ کیا ہوگا، یہ غالیچہ ہسپتال کی گندی بالٹی کی طرح حسین ہے، امراضِ خبیثہ کی طرح روح پرور ہے، یہ آگ اور پیپ کا دریا حتم طائی کے سفر کی یاد دلاتا ہے۔ قدیم اطالوی راہب مصوروں کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ غالیچہ نہیں ہے۔ تاریخ ہے، انسان کی روح کی!

وہ مسکرائی، دانت بے حد سفید تھے، لیکن ذرا ٹیڑھے میڑھے، اور ایک دوسرے سے بہت قریب، پھر بھی وہ مسکراہٹ اچھی معلوم ہوئی کہنے لگی۔ ”کیا آپ کبھی اٹلی گئے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”اٹلی کہاں! میں تو کبھی حضرت گنج کے اس پار نہیں گیا، عمر گزری ہے اسی پرانے میں، یہ پان کی دکان ہے اور سامنے وہ کافی ہاؤس۔“

مینجر نے اب تعارف کرنا مناسب سمجھا۔ بولا۔ ”آپ آرٹسٹ ہیں۔ کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ مس روپوتی ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے کالج میں پرنسپل ہو کر آئی ہیں۔ ابھی ابھی انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے یہاں....“

وہ بولی۔ ”چلتے تو یہ غالیچہ آپ ہی لے لیجئے مجھے تو خاص پسند نہیں۔“

”آپ کا بڑا احسان ہے۔“ میں نے غالیچہ کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ میرے ساتھ کافی پینا گوارا کریں گی، چلتے ناظر کافی ہاؤس

تک، اگر ناگوار خاطر، یعنی —

”شکریہ مگر میں ذرا یہ بلاؤز دیکھ لوں“ وہ پھر مسکرائی۔

مسکراہٹ بھی بھلی معلوم ہوئی، ذہین بیضیوی چہرے کا رنگ نہ تھا
صندلی رنگ پر لبوں کی ہلکی سی سُرخ اکن عجیب رسیلا توج سا پیدا کر
رہی تھی بلاؤز کا کپڑا خرید کر جب وہ میرے ساتھ چلنے لگی، تو لڑکھڑا گئی۔
میں نے ہانہ سے پکڑ کر سہارا دیا اور پوچھا: ”کیا بات ہے۔ کیا آپ ہمیشہ
لڑکھڑا کر چلتی ہیں؟“

وہ بولی ”نہیں تو....“ میں نے غور سے دیکھا۔ پاؤں پر پیٹی بندھی
ہوئی تھی۔

”زخم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ انگوٹھے کا ناخن بڑھ گیا تھا۔ جلد کے اندر.... جہاز کا نرسن
بالکل گدھا تھا.... اُس نے ہاتھ پر ساری کا پتو سر کا یا اور جب وہ پہلی بار
ٹری تو میں نے دیکھا اُس کے بالوں میں گردن کے قریب ایٹس طرف گلاب کے
زرد پھول ٹپکے ہوئے تھے، پھر جب وہ مڑی تو ماتھے کا قم قم درخشاں
نظر آیا۔ اس سے پہلے کیوں یہ قم قم اس قدر خوبصورت نہ تھا؟

غالیچہ

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت تھی، کچھ تو کافی ہاؤس میں روشنی کا انتظام ایسا ہے کہ مرد بد صورت نظر آتے ہیں، عورتیں حسین تر پھر۔ ماں۔ کچھ تو تھا، ورنہ یہ لوگ بار بار ڈر کر کیوں دیکھتے تھے، عورتیں تیز نگاہ سے کیوں گھورتی تھیں، سسے اتنی جلدی میز پر کیوں آجاتے تھے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگی۔۔۔ ”دیکھو بھرا، تھوڑا سا گرم دودھ اور گرم پانی ایک الگ پیالے میں۔“

”گرم پانی تو۔۔۔“ بیرے نے رک کر کہا۔

”تھوڑا سا گرم پانی، بس!“ وہ پھر مسکرائی، اور بیرا سر سے لے کر پاؤں تک پگھل گیا، جیسے اُس کا سارا جسم شیشے کا بنا ہو، میں اُسے پگھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور اُس کے سارے جسم کو پگھلاتی ہوئی چلی گئی، یہ نگاہ کیا ہے؟ یہ سچی کیسی ہے؟ کیا یہ کافی ہاؤس کی بچلیوں کا شعبہ تو نہیں؟

”اور بیرا۔۔۔ انڈے کے سینڈوچ!“ وہ پھر بولی۔

”بیرے نے واپس آکر کہا: ”جی انڈے کے سینڈوچ تو ختم ہو گئے۔“

”تھوڑے سے بھی نہیں؟“ اُس کی بڑی بڑی معصوم زخمی سی آنکھیں

غالیچہ

اور بھی کھلتی ہوئی معلوم ہوئیں، بس لاچار! ایک پلیٹ بھی نہیں؟“
سینڈ وچ بھی مل گئے۔

”نہیں بل میں ادا کروں گی“

”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں مرد ہوں۔“

وہ ہنسی۔ ”بہت پرانی بات ہے۔“ اور اس نے بل ادا کر دیا۔

گھر پر نوکر کو غالیچہ پسند نہ آیا، ان دنوں ایک تنک مزاج شاعر مہمان
تھا جو آزاد بکر میں نظمیں لکھتا کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور پانچ وقت نماز ادا
کرتا تھا، اُسے بھی غالیچہ پسند نہ آیا۔ میں نے پوچھا تو بس ”ہوں“ کر کے رہ
گیا، وہ نظمیں جتنی لمبی لکھتا تھا، باتیں اُسی نسبت سے کم کرتا تھا۔

”ہوں“ کا کیا مطلب ہے؟“ میں نے چڑھ کر کہا۔ ”کچھ تو کہو ان بنگوں

کا تناسب۔“

”ہوں۔“

رُوپ اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اُس بڑے بڑے شاعر سے کہنے لگی، اپنی تازہ نظم سناؤ..... تمہیں معلوم ہے

غالیچہ

آج کل اسپنڈرا اور لاڈن اعلامیت کے حق میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔

”ہوں“ وہ اپنی وارٹھی پر ہات پھیر کر خرا آیا۔

میں نے روپ سے پوچھا۔ ”تمہیں کینے معلوم ہے؟ کیا اُن لوگوں

نے تمہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں؟“

”نہیں۔ لیکن مجھے جو نے بتایا تھا۔“

”کون؟ جو؟“

”جو براؤن، نام نہیں سنا ہے کیا؟ آج کل آکسفورڈ کا محبوب ترین

شاعر ہے، ہندوستان میں ابھی اُس کا کلام نہیں پہنچا، لندن میں مجھ پر عاشق

ہو گیا تھا، وہ کچھ عجب، کچھ بیباک، کچھ شرمیلی سی بہنسی کے ساتھ کہنے لگی، او

ما تھے کا قلم یا قوت کی طرح دکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہاری زندگی فتوحات سے پر معلوم ہوتی ہے؟“

”نہیں“ اُس نے آہ بھر کر کہا۔ اس طرح کہ میرا جی چاہا اُسے گلے

سے لگاؤں۔

”ہوں“ شاعر بولا۔

روپ مسکرا کر کہنے لگی۔ ”تمہارا شاعر بہت باتونی ہے۔۔۔۔۔“

غالیچہ

..... سنو.... تمہیں ایک نظم سنا تی ہوں ۔“

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا : تم شاعر بھی ہو۔“

”نہیں یہ نظم میری والدہ نے کہی تھی۔“

”مٹھرو۔ مجھے یہ غالیچہ کچھا لینے دو۔“

غالیچہ کچھ گیا اور نظم روپ نے لگا کر سنائی، بنگالی نظم تھی، اُداس معزول
شبِ فراق کی جلی ہوئی شمع کی طرح خوبصورت تھی، آواز شعلے کی طرح
لرزاں، تاثر شراب کی طرح خمار لگائیں، بنگالی وڈیز انیس قطار اندر قطار
گھڑے اٹھائے ہوئے گھاٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ سمندر کی سبز لہریں
اچھل رہی تھیں۔ شوجی کا ڈمرو بج رہا تھا، پارہی رقص کر رہی تھیں، برف گر
رہی تھی..... اب فضا خاموش تھی اور روپ کی آنکھوں میں آنسو تھے
..... آنسو رخساروں سے ڈھلک کر غالیچے پر گر پڑے، اور وہ سرخ
مستطیل جیسے آگ کا شعلہ بن گئی۔۔۔۔۔

”تمہیں جو براؤن سے عشق نہیں ہوا۔ میں نے پوچھا۔

روپ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولی مجھے جس لڑکے سے عشق تھا
اُسے لندن ہی میں تپ دق ہو گیا تھا۔ وہ جہاز پر میرے ساتھ آ رہا تھا لیکن

غالیچہ

راستے ہی میں اس کی موت ہو گئی، عدن سے پرے بحیرہ سرخ میں!“
 ”بحیرہ سرخ“ میں نے سوچا۔ اور غالیچے کی سرخ مستطیل بحیرہ سرخ
 بن گئی، اور اس کے گہرے پانیوں میں مجھے اک زرد روکھانسا ہوا چہرہ نظر
 آیا، اور پھر بھنور میں غائب ہو گیا، محو خواب ہے۔ محو خواب ہے روپ کا
 محبوب، سرخ سمندر کے پانیوں میں، اور روپ کے آنسو میرے غالیچے
 پر گر رہے ہیں.....“

”ہوں“ شاعر نے کہا۔ اور میں نے ایک کتاب اس کے سر پر ڈالی۔
 روپ آنسوؤں میں مسکرا دی، بعض لوفات آنسوؤں سے آنسو پینا
 زیادہ اندوہناک معلوم ہوتا ہے!

روپ!

کیسی عجیب سی لڑکی تھی وہ، لندن میں شاعر جو براؤن اُسے محبت کرتا
 تھا، اور لکھنؤ میں حضرت گنج کا یہ ادارہ مزاج غریب آرٹسٹ اس کی محبت
 میں گرفتار ہو گیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زہر ہے، وہ کس طرح اس پیلے
 کو پی گیا، یا سیت، نامرادی، بے بسی، حشمت کا جواب ہمیشہ حشمت کیوں

غالیچہ

نہیں ہوتا؛ یکسی اگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں بُر
کی سل بن جاتی ہے، جو محروم تمنا کو آنسو رلاتی ہے اور جانِ تمنا کے لبوں پر
تبسم ریز سایہ بھی نہیں لاسکتی۔

میں نے غالیچے کو تھپکتے ہوئے پوچھا ۔
غالیچے نے کہا ۔ میں صلیب ہوں، میں دکھ اور درد جانتا ہوں دکھ
اور درد کی دوا نہیں جانتا !

اور روپ نے کہا ”یہ قسمت ہے، قسمت تمہیں غالیچہ خریدنے کے
لیے وہاں لے گئی، قسمت نے تمہیں مجھ سے روشناس ہونے کا موقعہ دیا، اب
یہ تمھاری قسمت ہے کہ مجھے تم سے وہ محبت نہ ہو سکی، ہزار کوشش کرنے پر
بھی یہ رفاقت محبت میں مبتدل نہیں ہو سکتی۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے؟“
پھر کہنے لگی ”شاعر اپنے شعر سناؤ“

چند روز کے بعد اس نے یکایک مجھ سے کہا ”مجھے تمھارے شاعر
سے محبت ہو گئی ہے“

”جھوٹ اس چند سے“

”اس کی آنکھیں دیکھیں تم نے“ وہ آہ بھر کر بولی ”جیسے مسیح دار پر

غالیچہ

لٹکا ہو۔ گمنا اندوہ ہے ان میں!

میں نے کہا: اگر تم کہو تو میں اپنی آنکھیں اندھی کر لوں۔
 شاید میری تلخی اُسے ناگوار گزری۔ سنجیدہ رُو ہو کر بولی: کیا کروں؟
 ”ہاں دل ہی تو ہے!“ میں نے طنزاً کہا۔
 ”ہوں“ شاعر بولا۔

جس روز وہ دونوں رخصت ہوئے، میں نے گھر پر ایک چھوٹی سی
 دعوت دی، روپے ڈھا کے کی سیاہ ساری پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں
 کاجل گہرا تھا۔ لیشی چڑیوں کا رنگ بھی سیاہ تھا، ہر روز اُسے دیکھ کر اُجھالے
 کا، سوُج کا، چاند کا، چاند کی کرن کا، روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے آج
 اُسے دیکھ دیکھ کر کیوں تاریکی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیوں وہ اس اپنی مکمل
 کامرانی کے لمحوں میں بھی مجھم یاس و غم کی تصویر دکھائی دیتی تھی، کیا یہ
 غریب آرٹسٹ کے دل کا اندھیرا تو نہیں تھا۔ کیا یہ اُس کے بُرش
 کی تاریکی تو نہ تھی! آج میں نے اُس سے وہی گیت سننے کی تمنا کی تھی جو اس
 نے پہلے روز گایا تھا..... مجھے یاد ہے گانے کے بعد وہ ناچ بھی تھی،
 میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا، میں اس کے پاؤں دیکھتا رہا، دھندلے

غالیچہ

دھندلے تاریک سے پاؤں جن میں جنا کی سُرخ لکیر بچلی کی طرح چمک چمک جاتی تھی، اُس تاریکی میں صرف یہاں روشنی تھی، وہ ناچتی رہی، اور میں اُس تاریکی میں حسائی لکیر کا ناچ دیکھتا رہا۔ اور جب ناچ بھی بند ہو گیا تو میں نے وہ پاؤں اٹھا کر اپنے سینے میں لکھ لیے، کیوں یہ پاؤں آج تک اس سینے میں محفوظ ہیں..... کیا اس اہرام میں مٹیوں کے سوائے اور کسی کے لیے جگہ نہیں؟

جب وہ چلی گئی تو میں پھر غالیچے پر آ بیٹھا، زرد گلاب کی ایک کٹی اس کے جوڑے سے نکل کر غالیچے پر پڑی رہ گئی تھی..... میرے دل میں شاید اب روپ کی کوئی یاد باقی نہیں، صرف یہ دو پاؤں ہیں اور اک یہ گلاب کی زرد کٹی..... کیسی تصویر ہے یہ؟ مصوّر ہو کر بھی میں نے شاید ایسی عجیب تصویر اس سے پہلے کبھی نہ بنائی تھی..... پھر؟

میں غالیچے سے پوچھتا ہوں۔

غالیچہ کہتا ہے ”میں تو صلیب ہوں، صلیب موت بخشتی ہے، اُسے زندگی کی ترتیب متناسب، تو اترے آگاہی نہیں.....“

اچھا اسے بھی جانے دو جو ہوا سو ہوا، اگر زندگی میں قبر ہی کا مزا لینا ہے تو کیوں نہ اسے آرام سے حاصل کیا جائے، اگر شہد میں زہر ہی ملا کے مینا ہے تو کیوں نہ خالص زہر پیا جائے، اگر معصومیت برقرار نہیں رہ سکتی، تو کیوں نہ گہری معصیت کی آغوش میں پناہ لی جائے، آؤ، اپنے دل میں ضمیر کی جواک ہلکی سی شمع رہ گئی ہے اسے بھی خاموش کر دیں اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں گناہ کے پھیلنے آہوئے دود کو دیکھیں اور زندگی کا منہ چڑائیں اور قہقہے لگائیں۔

محبت نہ سہی، بوالہوسی سہی!

آرٹسٹ نے اک اور لڑکی سے آشنائی پیدا کر لی، جو ویک میں ملازم تھی، اس کا نام تھا آشا، لیکن صورت پر بالکل نر اشا برستی تھی، ایسی بھوکی لڑکی تھی وہ کبھی مرد دیکھا ہی نہ تھا، گتیا کی طرح ساتھ ساتھ لگی پھرتی تھی، بے چاری، آرٹسٹ کو شاید اس پر رحم آنے لگا تھا، وہ اس کے ساتھ شفقت برتنے لگا، اک مرتبہ، پیرانہ انداز کے ساتھ اب وہ اسے ہر جگہ لیے لیے پھرتا، لوگ طنزاً اس کے حسن انتخاب کی داد دیتے، اور وہ بظاہر بڑے خلوص سے داد قبول کرتا، کوئی کہتا، بھئی، بڑی بد صورت ہے وہ، تم نے کیا سچ کر۔ تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتا، گھنٹوں اس کی خوبصورتی کا تجزیہ کرتا کرتا۔

اُس نے اُشاک کی تصویر بنائی تھی اور اپنے سٹوڈیو میں ہر کس ونا کس کو وہ یہ تصویر دکھاتا تھا۔ وہ اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ دیکھو..... دیکھو..... دیکھو..... مجھے تمھاری کیا پروا ہے..... میں اپنی روح کا آپ مالک ہوں.....
..... زہر خندا!..... کوٹلے!

لیکن وہ جو کبھی حضرت گنج کے اُس پار نہ گیا تھا۔ اب وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا، فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ ہزاروں الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتا، رگنڈر کے ہر پتھر پر اُسے کسی کے پیروں کے دھندلے دھندلے سائے کانپتے ہوئے معلوم ہوتے، کافی کی پیالی کے ہر سانس میں وہ اُس کے گرم سانس کا مس محسوس کرتا، اور برقی شمع دانوں کے برآق جیسے میں اسے ہزاروں قم قم تیرتے ہوئے دکھائی دیتے، یہ سنسی؟ وہ مڑ مڑ دیکھتا کہاں سے آئی تھی، لیکن یہ تو وہی کشمیری بالٹو مینا اپنے پنجرے میں چپک رہی تھی، بلبل قفس کی سیلیاں توڑ کر پرواز کر گئی تھی اور وہ ابھی تک کیوں حضرت گنج کے دہرائے میں مقید تھا... کیوں؟ کیوں؟ وہ حنائی لکیر بار بار بجلی کی طرح چپک کر اس سے بار بار پوچھ رہی تھی!

اب جبکہ وہ خنجر چھوڑ کر جا رہا تھا اس نے اپنے سب دوستوں کو اس

غالیچہ

ویک لڑکی کو اور اُس کی سب سیلیوں کو آخری دعوت دی تھی، اور جب دعوت کے بعد سب لوگ چلے گئے تھے۔ تو ویک لڑکی حیران و پریشان اسی غالیچے پر بیٹھی رہی تھی، اور پھر بنائیک اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی تھی، یہ گرم گرم آنسو جو اُس کے سینے میں برف کے پھول بنے جا رہے تھے، عشق کا جواب عشق کیوں نہیں ہوتا، یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سل بن جاتی ہے۔

ایک لڑکی غالیچے پر بیٹھی تھی، بازو اوپر کے خطوط و حدانی کے ٹک میں تھے پاؤں نیچے کے خطوط و حدانی میں، غالیچے نے چپکے سے اس کے دل میں اک سیاہ منہ ٹھونک دی، اہرام کے لیے ایک اور می تیار ہو گئی لیکن وہاں جگہ کہاں تھی، سینے میں اب بھی وہی دو پاؤں ناچ رہے تھے۔۔۔ اور وہی گلاب کی اک زر دکلی!

میں نے غالیچے سے پوچھا۔ ”یہ کیسا کھیل ہے؟ میں کس کا منہ چڑا رہا ہوں یہ زخم کس کے ہیں؟ یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے؟ اگر یہ سب قسمت ہے، تو پھر یہ کاوش بہیم کی ہے جو می کو بھی زندہ کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔“ غالیچے نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میں تو ایک حلیب ہوں۔“

غالیچہ

جودل میں سیاہ کیل ٹھونکتی ہے، سپید روشنی نہیں لاتی، جو قسمت کا انجام
دکھاتی ہے، اُس کا آغاز و شباب نہیں!
تجھے جلا کر خاک زکرو ڈالوں!

اس نئے شہر میں!
چار آدمی غالیچے پر تاش کھیل رہے ہیں۔
دو ایکٹر
دو تجارت

اور جو تماشا دکھا رہا ہے وہ آرٹسٹ ہے!
تاش کھیلتے کھیلتے ایکٹر اور تجارتی رٹنا شروع کرتے ہیں، ہاتھ پائی
کی نوبت آتی ہے، غالیچہ نوچا جاتا ہے، کیونکہ ایکٹ چال میں ایک تجارتی غلطی
سے یا جان بوجھ کر اکٹھے آنے زیادہ لے گیا تھا، میرا گریبان تار تار رہ چکا
ہے، کیونکہ جو آدمی لڑائی رفع کرنا چاہتا ہے، وہی سب سے زیادہ مٹتا ہے۔
پھر میں سوچتا ہوں۔ اس بدفرگی کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے، بدقسمتی،
ناممکن! اگر موفوں، واہیات، اچھے! لعنت! شراب، سبحان اللہ!

غالیچ

سب لوگ شراب پی رہے ہیں، آرٹسٹ کی آنکھیں سُرخ ہیں، ہمیشہ
ہنسنے اور خوش رہنے والا خوش شکل ایکٹر ہمیشہ چپ رہنے والے قبول صورت
ایکٹر سے کہہ رہا ہے ”محبت، محبت؟ سالانہ محبت کیا جانے، ابھی کالج
کالونڈر ہے تو..... ایس..... محبت کا نشہ مجھ سے پوچھ..... سالی
شراب بھی بالکل تلخ نہیں ہے.... رانی کو دیکھا ہے تو نے؟“

”رانی سلسلہ کی بہترین ایکٹرس ہے نا“ میں نے پوچھا۔
”جی ہاں، وہ — دہی — سالانہ تو کیا اہلنے.... وہ میری محبوبہ
ہے.... سمجھے؟..... ایس؟ میں نے اس کے لیے اپنے ماں باپ
کی گالیاں کھائیں..... کئی لڑائیاں لڑیں رقیبوں سے..... اپنا گھر بار
چھوڑ دیا..... یہ انگوٹھی شلے دیکھتے ہو، یہ قیمتی کسٹن، یہ کف بٹن۔
یہ سب سونے کے ہیں، شلے تو کیا اہلنے... یہ سب اس نے دیے ہیں۔
... تخفے.... مگر میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں کروں گا۔
اس نے فیصلہ کن اندازہ میں کہا۔

”کیوں؟“

وہ مجھے جاہتی ہے۔ پروہ مجھ سے بہت امیر ہے.... وہ جاہتی ہے۔

غالیچہ

کہ مجھ سے شادی کرے، پر میں مرھاؤں گا، اس سے بیاہ نہیں کروں گا۔
تھیں اس سے محبت نہیں! ایک بتا رہے پڑھا۔

”لیکن بھئی گھرائی دولت کیوں چھوڑتے ہو؟ دوسرے بتا رہے پڑھا۔
ایکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ”میں جو ہوں وہی رہوں گا۔ میں اُس سے
محبت کرتا ہوں، لیکن اس کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ میں اُس کی محبت
چاہتا ہوں۔ دولت نہیں! اوج!“ ایکٹر نے زور سے غالیچے پر ہات مار
کر کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا!

غالیچہ کانپ اٹھا۔ اُس کا رنگ عجب سا ہو گیا۔
”اور شراب دے حرامزادے!“ وہ اپنے خالی گلاس کو ٹٹول رہا تھا۔
میں نے کہا رانی، اے بھئی آج ہی تو میں نے اخبار میں پڑھا ہے
کہ رانی نے ایک امریکن سے شادی کر لی۔“

ایکٹر نے آہستہ سے شراب کا گلاس غالیچے پر نڈھا دیا۔ اُس کی
انگلیاں کاسچ کی سطح پر سختی سے جم گئیں۔ کاسچ اس کی انگلیوں کو زخمی کرتا
ہوا دیرہ دیرہ ہو گیا۔

وہ زہرے ہوئے گلے سے کہنے لگا۔ ”یہ غلط ہے، بالکل غلط ہے!“

غالیچہ

آرٹسٹ نے میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھا۔
ایکٹر کا چہرہ!..... وہ غالیچے پر دونوں کنپیاں ٹیکے میری طرف دیکھ رہا تھا..... اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس کا چہرہ متا جا رہا تھا۔
مئی کے خدو خال ابھر رہے تھے۔

”یہ غلط ہے۔ بالکل غلط ہے“ وہ پھر چیخا، پھر اک دم خاموش ہو گیا۔
دوسرا ایکٹر اُس کے گلاس میں شراب اُنڈیلنے لگا۔ وہ اب بھی خاموش تھا، لیکن پہلا
ایکٹر غالیچے سے لگ کر سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اُس نے غالیچے پر تے کر
دی..... مجھے غالیچے کا رنگ اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ سُرخ سے سپید زرد
جیسے یہ غالیچہ نہ ہو زندگی کا کفن ہو۔

رانی! رانی! رانی!!

صبح میں نے غالیچہ دھلوا یا، اور صاف کروا کے پھر کمرے میں رکھا۔
کہ میری محبوبہ کمرے میں داخل ہوئی، یہ میری نئے شہر کی محبوبہ تھی، یہاں آکر
آرٹسٹ نے پھر عشق کر لیا تھا عشق کرنا کس قدر مشکل ہے لیکن جب عشق
مر جاٹے، اُس کے بعد عشق کرنا کس قدر آسان ہو جاتا ہے! ہے نا!
مردود بولتے لیوں نہیں ہو، جواب دو! میری محبوبہ کے ہونٹ موٹے

تھے، رخسار بھی موٹے جسم بھی موٹا، منہسی بھی موٹی، عقل بھی موٹی، وہ عورت نہ تھی، اک دہرا تر اغالیچہ تھی، آج اس نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنا ڈالی تھیں، اور ان میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے۔
وہ غالیچے پر اکڑ بیٹھ گئی۔

میں نے اس کی بلائیں لے کر کہا: ”آج تو تم قلو پٹرہ کو بھی مات کرتی ہو۔“
”کلہو پتر کیا ہے؟“ اُس نے پوچھا۔
”مصر کی ملکہ تھی۔“

”میسرہ؟“

”ہاں مصر، وہ ملک جہاں مرنے کے بعد اہرام تیار ہوتے ہیں۔ اور مردوں کی ممیاں تیار کی جاتی ہیں..... خدا کرے تمہاری موت بھی قلو پٹرہ کی طرح ہو!“

”ہائے کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا ہو اُتھا اُسے.....!“

”سانپ سے ڈسو اگر مر گئی تھی!“

وہ اک ہلکی سی چیخ مار کر میرے قریب آ گئی۔ ”ڈراتے ہو مجھے۔“ اُس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ پھر وہ منہسی، اپنی موٹی بھدی منہسی، جیسے بھینس جگالی کر

رہی ہے..... پھر اُس نے اپنے ہونٹ میرے آگے بڑھا دیے، جیسے کوئی
فیاض جھاٹ کسی اجنبی شہری کو گنا چوسنے کو دے دے !

میں نے گنا چوستے چوستے کہا ” یہ غالیچہ جیتا ایک بار ہے، لیکن مرنے
بار بار ہے.... آہ.... یہ موت بار بار کیوں آتی ہے.... اب ابھی جائے
آخری موت!“

” آج یہ تم کیوں بار بار موت کا ذکر کر رہے ہو، وہ ممنناٹی۔
” کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی“ میں نے کہا ” ہاں یہ تو بتاؤ آج تمہارے
تازہ لبوں سے، رخساروں سے، آنکھوں سے، بالوں سے، یہ کیسی
لطیف خوشبو نکل رہی ہے۔“

” کچھ نہیں!“ وہ ہنس کر بولی ” آج کھڑے سے کاخو شہزادہ رتیل لگایا ہے!“
میں نے غالیچے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا، اس کا رنگ اُڑتا جا رہا تھا
بے چارہ ایک بار پھر مرد ہوا تھا، اُس کی جانکئی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی، میں
گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

سیدھا سٹیشن پہنچ گیا، ارادہ تھا، جی بھر کر بریپیوں کا، نہ صرف
اپنے گردن کو بلکہ اپنی رُوح کو بھی جلا ب دل لگا۔ تاکہ یہ سارا کوڑا کرکٹ

غالیچہ

برجائے، نکل جائے، طبیعت، ہلکی ہو جائے۔

سٹیشن پر تیرے پہلے روپ مل گئی۔

”اے؟ تم کہاں؟“

”جو ناگڑھ گئی تھی پہاڑ پر۔“

”اور شاعر؟“

وہ کھانس کر کہنے لگی، اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔“

”چھوڑ دیا ہے کیوں!“

”مجھے تپ دق ہے، جو ناگڑھ سینی ٹوریم میں گئی تھی نا!“

اس کی نگاہوں میں بے زنگ کا سمندر تھا، اور اک زرد و زنجیف چہرہ

بھنور میں غوطے کھا رہا تھا۔ چہرہ بھی غائب ہو گیا، اب شاعر کا سٹرا

بُسا بُشرہ لہروں میں تیسے لگا، شاعر کا چہرہ سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ”ہوں۔“

میں نے کہا: ”کہاں ہے وہ حرام زادہ!“

”جانے دو۔ وہ محزوں انداز میں کہنے لگی۔ اسے گالی نہ دو۔۔۔ مجھے

اُس سے ابھی تک محبت ہے!“

”لیکن۔“

”ہاں“ وہ بولی۔ ”اس لیکن کے بعد بھی۔ اب میں اپنے گھر جا رہی ہوں، شیکے، آرام سے مروں گی۔“

”نہیں، نہیں، میں نے سختی سے کہا۔“ اب میں تمہیں نہیں جاننے دوں گا، زندگی نے تمہیں مجھ سے چھین لیا، اب موت کے دروازے تک ہم دونوں اکٹھے چلیں گے، اور اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا ہے تو شاید؟۔“ وہ ہنسی، وہی اجیالی ہنسی، وہی صندلی چہرہ، وہی دکھتا ہوا قم قم۔ میں نے اُس کی ہانہ پکڑ کر کہا۔ ”گھر چلو۔“ روپ اجیتے جی تم نے مجھے اپنے ساتھ نہ لےنے دیا۔ اب موت کے چند لمحے تو بخش دو۔“

وہ مسکرائی۔ بولی۔ ”تم نہیں جانتے؟ محبت زندگی میں اور موت میں بھی یکساں سلوک کرتی ہے!“ گاڑی نے سیٹی دی۔

وہ بولی۔ ”مجھے امید نہ تھی تم کبھی ملو گے! افسوس ہے کہ میں یہاں تک نہیں سکتی، ہاں یہ کتاب تمہیں دے سکتی ہوں، انکے کی نقلیں۔“ گاڑی نے جھنڈی دکھائی۔

وہ اپنے ڈبے کی طرف چل دی، میں اُس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ

غالیچہ

سکا۔ میری آنکھیں پھر اس کے پاؤں پر گر گئیں، وہ پاؤں چلتے گئے، چلتے گئے۔

دور جاتے ہوئے بھی گویا قریب آتے گئے، بالکل میرے سینے پر آ گئے، اور میں نے انہیں اٹھا کر اپنے سینے کے اندر چھپا لیا.....
میں نے نگاہ اٹھائی۔
گاڑی جا چکی تھی۔

محبوبہ ابھی تک میری راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ ”کہاں چلے گئے تھے؟“
میں چپ ہو رہا۔

”یہ کونسی کتاب ہے؟“

”الکے کی۔“

”کیا؟“

”ایک شاعر کی نظمیں ہیں۔“

”مجھے سناؤ۔ کیا کتاب ہے یہ؟“

میں نے کتاب کھولی، پندرہواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا۔ اہستہ

غالیچہ

سے پڑھنا شروع کیا۔ اے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔ اب موت تیری مرضی کے مطابق بخش دے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوند! ”
 ”پھر موت!“ وہ بولی۔ ”برا شگون ہے۔“ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے پھینک کر الگ کر دی اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیے غالیچہ ابل رہا تھا، بالکل آگ تھا۔ شعلوں کا دریا۔ پیپ کا سمندر زہر کا کھوتا ہوا گرم پیٹمہ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تم صلیب ہو، تم نے آدمی کے بیٹے کو مسیحا بنا دیا۔ بتاؤ مجھے کیا بناؤ گے؟“
 غالیچہ نے کہا۔ ”جو تم خود ہی چکے ہو، اک اہرام۔ اک کھوکھلا اہرام۔ جس کے سینے میں مہیاں دفن ہیں۔“

میں نے اپنی محبوبہ سے کہا۔ ”میرا جی چاہتا ہے۔ اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں! پرانا تو ہو گیا ہے۔“

”لیکن“ میں نے رُک کر افسردہ لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس تو یہی

ایک غالیچہ ہے۔ اور یہی ایک زندگی ہے۔ نہ اسے بدل سکتا ہوں اُسے...!!!“
 یہ کہہ کر آرٹسٹ گناچو سنے لگا۔

ایک اکسٹرالٹ کی

یہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۲ء کی دوپہر کا واقعہ ہے میں کھانا کھا کر اپنے دفتری میز پر سرٹیکے اونگھ رہا تھا کہ کمرے میں ایک اکسٹرالٹ کی داخل ہوئی۔ یوں تو ایک ہیروئن اور ایک اکسٹرالٹ کی میں وجہ تفریق کی بہت سی باتیں ہیں، لیکن ایک موٹی سی بات جو مجھے ایسے کندوہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ہیروئن اس طرح میرے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جب ہیروئن یا کوئی اہم کردار ادا کرنے والی مشملہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کسی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ تو اس کمرے میں تین چار آدمی اس کی پیشوائی کے لیے ضرور موجود رہتے ہیں، اس کی آمد کی خبر پہلے سے کر دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی کندہ نائراش

ایک اکسٹرا لڑکی

کاسٹرمینز پر اونگھتا ہوا نظر آجائے تو اسے ٹھوکے دے کر پہلے ہی سے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ ”ہوشیار باش، مسئلہ آرہی ہے۔“ اور چونکہ اس دوپہر کو اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اس لیے یقیناً وہ لڑکی جو گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میرے کمرے میں داخل ہوئی اکسٹرا لڑکی تھی۔

اس لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ وہ سنس کر مجھ سے کہنے لگی کہ گھر والے اسے ”زیب“ ”زیب“ کہہ کر پکارتے ہیں میں نے یہ کہہ کر مال دیا کہ اس طرح کہنا کچھ گھروالوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ بہر حال۔ ”زیب“ نام کی ایک اور لڑکی کو بھی میں جانتا ہوں۔ لیکن اس کی کہانی پھر کبھی لکھوں گا۔ کیونکہ اس کے ڈرامے میں حرفِ سوالیہ بھی آیا ہے۔ اور اس زیب کے افسانے میں حرفِ سوالیہ اگر گزر گیا ہے، یہ حرفِ سوالیہ بھی زندگی میں کئی ڈھنگ سے آتا ہے، کبھی تو یہ محبوب کے بوسے کی طرح شہد آگیں ہوتا ہے اور کبھی ناکام تمناؤں کی طرح تلخ، کبھی اس کی تشکیل سرخ انگاروں سے ہوتی ہے، اور کبھی آنسوؤں کے نمکین پانی سے، لیکن ہر زندگی میں ایک بار تو یہ حرفِ سوالیہ ضرور آتا ہے، یہ بڑا دلچسپ مرحلہ ہوتا ہے، زیب یعنی وہ زیب نہیں جس کی کہانی میں اب لکھ رہا ہوں، بلکہ وہ زیب جس

ایک اکسٹرا لڑکی

کی کہانی میں پھر کبھی لکھوں گا۔ ابھی اس مرحلے میں سے گزر رہی ہے، اور میں بحیثیت ایک تماشائی کے سے کسی قسم کا مشورہ نہیں دینا چاہتا، اس سے صرف توقع کرتا ہوں کہ اگر کبھی یہ سطور اس کی نظر سے گزریں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جائے۔ اور اگر نہ مسکرائے تو اور بھی بہتر ہوگا۔

زبیدہ نوکری کی تلاش میں آئی تھی، اور سٹوڈیو کے مالک نے غالباً مجھے سب سے بے ضرر اور مرخجان مریخ آدمی سمجھ کر اس کام پر تعینات کیا تھا۔ کہ میں اکسٹر امدوں اور اکسٹر اعورتوں کی شکل و صورت اور ان کی اداکاری کے امکانات کا صحیح جائزہ لوں، یہ اندازہ اس نے میرے گنجے سر، دبیز چینک، اور اس بے اعتنائی سے لگایا تھا جس کا مظاہرہ میں اکثر صنفِ نازک کے سامنے کیا کرتا ہوں۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ تو محض اک مافعتی حربہ ہے، ورنہ میری جلد کے نیچے بھی وہی تیز لہو دوڑتا ہے۔ اور احساسات کے مہیلاؤں میں وہی جنسی آگ شعلہ زن ہے اور ٹھنڈی یخ، بریلی نگاہوں کی بدلیوں میں بجلیوں کے کوندے مستور ہیں، شاید وہ سب کچھ سمجھتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس قدر کمزور ہوں کہ اپنی جھوٹی شرافت کے خول کو توڑنے کی سکت بھی مجھ میں نہیں۔ اس لیے میں درحقیقت بے ضرر

ایک کسٹرائٹی

ہوں۔ یہ حقیقت بڑی تکلیف دہ ہے، اور داستان بیان کرتے وقت کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تکلیف دہ ہونے کے بجائے یہ میرے لیے اکثر و برسرِ تن بن جاتی ہے، اور میں اس جھوٹی شرافت کے سرِ حشمت سے اپنے لیے کئی بار احساسِ برتری مستعار لے لیا کرتا ہوں۔ تم نہیں سمجھو گے۔ لیکن وہ زیب — میرا مطلب ہے وہ زیب ضرور سمجھ جائے گی جس کے لیے میں یہ کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔

ہاں تو زبیدہ اُس دوپہر کو میرے کمرے میں ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہوئی۔ زبیدہ چھٹی لڑکی تھی، جس سے اُس روز مجھے انٹرویو کرنا پڑا۔ سب سے پہلے جو لڑکی آئی تھی وہ اپنے دو بھائی بھی ساتھ لائی تھی ایک کا نام بے بی گنگرے تھا، اور دوسرے کا نام جانی لاپو، وہ گجراتی لڑکی تھی۔ پرانی کمان کی طرح ڈھیلی ڈھالی، ناک نقشہ، چال ڈھال، بات چیت میں ایک غیر معین ناہمواری، بے دلی، بے سلیقگی، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ عورت ابھی ابھی گیلی مٹی سے بنائی گئی ہے، اور اس کے فوراً بعد ہی میرے کمرے میں انٹرویو کے لیے وکیل دی گئی ہے، میں نے اُسے ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔

ایک اسٹراٹگی

اُسے کہا: ”آپ کا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ جب ہمیں کسی فلم میں آپ کی ضرورت ہوگی۔ آپ کو ضرور بلا لیا جائے گا۔“ دل میں کہا: جاؤ۔ آفتاب کی کرنوں میں غسل کرو۔ زندگی کے جھونکوں سے اپنی شخصیت کو نکرانے دو۔ جب یہ گیلی مٹی سُکھ جائے گی۔ پھر یہاں آنا۔
لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کی گیلی مٹی کبھی نہ سُکھے گی۔ ”میرا پتہ — میرا پتہ آپ نے نوٹ کر لیا ہے نا“

”ہاں۔ ہاں نوٹ کر لیا ہے۔“

”اچھی طرح نوٹ کر لیا ہے نا۔ ملو بھائی سارا بھائی لین مکان نمبر

۴۵۰ مکان نمبر ۴۵۰ نہ بھولے گا۔ شہراحمد آباد.....“

”گھبرائیے نہیں۔ آپ کا پتہ میرے پاس بالکل محفوظ ہے۔“

”تو آپ مجھے ضرور بلائیں گے نا۔“

”ضرور — تسلی رکھیے۔ نہ بلانے کی کوئی وجہ نہیں۔“

”اچھا تو — وہ میرا پتہ۔“

”نہتے“ میں نے ہات جوڑ کر جلدی سے کہا۔

وہ الٹے پاؤں ہات جوڑ کر کمرے سے باہر آہستہ آہستہ نکلتی گئی گیلی مٹی

ایک اکثرالوطی

تھی چل بھی نہ سکتی تھی اچھی طرح سے۔ جلاتے ہوئے چوکھٹ سے ٹکرا گئی۔ پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔ کون کتا ہے غائب ہو گئی۔ ابھی تک میری نگاہوں میں محفوظ ہے۔ اس کسے کی میز پر اس فرش پر، اس چوکھٹ پر اس دروازے کے شیشوں پر اس گیلی مٹی کے نشان ہیں۔ دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے۔

دوسری لڑکی بھوار پیٹھ پونا سے آئی تھی۔ پونا سے ممبئی آئی تھی۔ گلابی رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی، اور اس کے اندر سے اس کا جسم اک خشک تنے کی طرح نظر آ رہا تھا، اس کی نگاہیں ویران تھیں، اس کے لب ویران تھے، اور اس کا سینہ ویران تھا، وہ اک لٹے ہوئے شخص کی طرح آکر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس طرح بیٹھ گئی گویا کہہ رہی ہو۔ میں جانتی ہوں تم مجھے ملازمت نہیں دو گے۔ میں جانتی ہوں مجھ میں رس، شعریت نہیں، نسائیت نہیں، پھر بھی میں تمھارے پاس آئی ہوں۔ کیا اس بے حیائی، ڈھٹائی کو کوئی امید بر نہ آئی؟ کی بھی داد نہ دو گے۔

میں نے دل میں کہا ”مطلق نہیں“ اور اس سے پوچھا ”تمھارا نام“

ایک اکسٹرا لڑکی

”کو مشیا“

”تم بدھوا بیٹھ پونا سے آئی ہو۔“

”ہا ہو۔“

”ہا ہو؟“ میں نے کہا۔ ”تم امرتسر کی رہنے والی معلوم ہوتی ہو۔“
 ”خوب بچا نام نے۔“ اُس نے منہس کر کہا۔ اور اس کے سیاہی مائل
 زرد دانت جیروں میں اکھڑی ہوئی جڑوں کے سٹروں کی طرح دکھائی دینے لگے۔
 ”پہلے کسی تصویر میں کام کیا ہے۔“

”ہا ہو! حکم دیکھ، تے جادوگر باج بہ اور، چٹ پٹ منگنی، میں
 گاتی بھی ہوں، بدھوا بیٹھ میں اپنا کوٹھا ہے۔ کبھی آؤ دیاں؟“
 میں نے پوچھا۔ ”تم امرت سر سے پونا کیسے آگئیں؟“

”رزق!“ اس نے آہستہ سے کہا۔ بے دلی سے کہا۔ بے بس بے جان
 بے نور لہجے میں کہا۔ اُس کی نگاہوں میں، اُس کے جسم میں، اس کی روح میں
 تاریکی ہی تاریکی تھی اور اسے دیکھ کر ایک کراہت آمیز نفرت کا احساس
 میرے دل میں بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ شاید وہ عورت نہ تھی، تاریک گندے
 گیسے بانی میں پیدا ہونے والی جو تک تھی جو میری میز پر دھری تھی۔ اور آہستہ آہستہ

ایک اکسٹرا لڑکی

میری طرف رینگ رہی تھی۔

”جاؤ، جاؤ....“ میں نے چلا کر کہا۔

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا: ”در اہل بات یہ ہے کہ ابھی فلم کے شرع ہونے میں دو ماہ باقی ہیں۔ ہمیں یقیناً آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی اور بھی بہت سی لڑکیاں....“

وہ میری بات کاٹ کر بولی، میری چھوٹی بہن گو متی بھی میرے ساتھ آئی ہے....“ اوگو متی ادھر آ۔“

بڑی جونک، چھوٹی جونک! اُس سے چھوٹی جونک....
”ہاں آپ کو اور آپ کی بہن کو بھی ضرور بلاؤں گا۔ فی الحال تو۔
اچھا ملتے“

”میرے فوٹو ہیں۔“ اُس نے اٹھتے ہوئے اپنی کلابی ساڑھی کا پتہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ہو پونا کد می آؤ تو ہمارے کوٹھے ضرور آنا۔“
وہ دونوں چلی گئیں، بڑی جونک چھوٹی جونک.....!

تیسری لڑکی مراٹھی تھی، مراٹھی لڑکیوں کے بدن میں بالعموم اک
دلکش تناؤ ہوتا ہے اور انکھوں میں اک بے بس ہرنی کی سی مغنویت ہوتی ہے۔ جسے

ایک اسٹراٹجی

مرد بالعموم بہت پسند کرتے ہیں، لیکن یہ لڑکی بے بس ضرور نظر آتی تھی،..... لیکن ہر فی نہیں۔ نگاہوں میں تناؤ ضرور تھا لیکن جسم میں اس حقیقت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ عجیب بے ڈھنگی سی۔ لگڑ بگڑ یا چرخ کی سی چال چلتی ہوئی اندرائی، اس کے ساتھ اس کا خاوند تھا۔ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی دانت نکال کر مسکرانے لگا۔ اور جب تک کمرے میں رہا۔ اسی طرح مسکراتا رہا۔ خدا جانے یہ کمرے کی فضا کا اثر تھا یا میری صورت کا، یا اُس خوش آئند تصویر کا جو اُس کی بیوی کے مشابہ بن جانے کی صورت میں اُس کے مستقبل کی ہوتی۔ شاید اُس کی مسکراہٹ اُس حروفِ سوالیہ کا جواب تھی جو آج اس بد نصیب جوڑے کے مقدر میں لکھا جا رہا تھا۔ اکثر اوقات آدمی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ حروفِ سوالیہ اُس کے سامنے ہے، اور اُس سے زندگی کا، اُس کی اہمیت کا، اُس کے توازن کا، اس کے بنیادی اخلاق کا جواب طلب کر رہا ہے، وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا اور یونہی اجماعانہ طریق پر مسکراتے جاتا ہے، یہ آدمی یہی کر رہا تھا۔ بیس سال بعد جب یہ گنجی ہو جائے گا۔ اور اس کی آنکھوں پر دبیز عینک چڑھی ہوگی۔ میری طرح روئے گا، مسکرانے دو ابھی اسے.....

ایک اکسٹرالو کی

”یہ میرا بیوی ہے“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”نوکری کرنے ہوتا ہے“

”ہندی یا اردو جانتی ہے؟“

”ہو۔ بھارچا نکلا.... (بہت اچھا)

میں نے کہا۔ ”اچھا تو لکھو.... ایسے میں اس لکھو ہی کے گھر کیوں...“

”ناہیں.... ناہیں۔ لکھنے کو نہیں مانگتا۔ میرا بیوی زبانی یاد کرنا۔ تم اس کو بتانا۔ یہ اکسٹری.... بھارچا نکلا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا تو کوشب چراغ۔“

”شب چراغ“

”شب چراغ نہیں۔ شب چراغ۔“

”شب چراغ۔۔۔ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ ہنستی کیوں ہے“

وہ اپنی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ”ایہ.... بہا سے بولی

میں اس کو گالی بولتا۔ بڑا گالی۔“

”بھارچا نکلا“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”شب چراغ۔“

”نہیں.... نہیں....“ وہ اب شراگئی۔ شرماتے وقت اتنی ہی توف

ایک اکسٹرا لٹکی

اور احسن معلوم ہونے لگی وہ

”پہلے کسی تصویر میں کام کیا؟“ میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔

”ناہیں، ناہیں۔ ہمارا بیوی کو صر کام نہیں مانگتا۔ ام شریچہ لوگ اے

اگرے، تکرے ام بولا۔ اس کمپنی کا لوگ بوسٹ آچا، اس کو مشکل سے اچی

کرتا۔ میرا بیوی بولتا۔ تم اے ساتھ ہوتا تو ہم کام کرتا ہوں ام بولا۔ پچا چا نکلا

ام بھی تمہارے سنگ کا م کرتا۔ ام اس کے سنگ اتی پریم کرتا۔

”پچا چا نکلا!“ میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا پتہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ آخر میں میں نے اس جوڑے سے

کہا۔ ۵۰ کالبا دیوی لین، پورا نامندر۔ بمبئی ۱۹ میں ہے نا۔ بہت جلدی

تمہیں بلانے کی کوشش کروں گا۔“

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔ میں نے اپنا جواب دہرایا۔ وہ پھر بھی

مسکراتا رہا۔ میں نے انہیں رخصت کرنے کے لیے ہات بڑھایا۔ اس نے

ہات جوڑ دیے اور مسکراتا رہا۔ اس کے کوٹ کا کالر تین جگہ سے پھٹا ہوا تھا

اُس لٹکی کی دھوتی کو گھر کی ڈھلی ہوئی ہتی لیکن سخت بوسیدہ تھی۔ اٹھتے وقت

مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ سچ مچ سب سے ہرنی

ایک اکسٹرا لڑکی

تھی۔ اُس کی نگاہیں زمین پر گر گئیں اور اس کا خاندان مسکراتا رہا۔ واپس جاتے ہوئے، میری طرف دیکھتے ہوئے برابر مسکراتا رہا۔ اور جب وہ میرے کمرے کے باہر چلا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہنسی نہ تھی، یہ روناتھا۔ اُس کی شرافت بھی میری طرح جھوٹی تھی اور جگہ جگہ سے بھٹی ہوئی تھی۔ اور وہ اس میں تبسم کا پیوند لگا کر اپنی غربت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف، اپنی بیوی کو بیچنے آیا تھا، اور مسکراتا تھا۔ اور اُس کی مسکراہٹ میں انسانیت کا خون تھا، یہ باتیں میں اب تم سے بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ اس وقت میں نے اُس سے صرف یہ کہا تھا۔ میں تمہیں ضرور بلانے کی کوشش کروں گا، یہ جھوٹ ضرور تھا کیونکہ وہ دونوں خاندان بیوی کسی ہندوستانی فلم میں کام کرنے کے لیے قطعی ناموزوں تھے لیکن یہ ایک معمولی سا جھوٹ تھا۔ اتنا معمولی جتنا اس آدمی کا تبسم، ایک سیدھا سادا عام جھوٹ ایک جھوٹے آدمی نے دوسرے جھوٹے آدمی سے جھوٹ بولا۔ بس اور کیا... پانچویں لڑکی نہ تھی، دھیر عمر کی عورت تھی، تین بچوں کی ماں، دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ بیوہ اور فرہ اندام، اور گلابھاری، خوش رنگ، آتے ہی پھسکڑا مار کر کرسی پر بیٹھ گئی، پھر بیڑی نکال کر سلگانے لگی۔ بولی۔ ”کیسی نے کامے کو

ایک اسٹراٹگی

اشتہار دیا ہے۔“

”اسٹراٹگیوں کی ضرورت ہے۔“

”ہا ہا ہا“ وہ بٹیری کا دھواں میرے چہرے پر کھیرتے ہوئے بولی۔

”کتنے روپے دو گے۔“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”تم نے کہیں کام بھی کیا ہے یا پونہی۔“

وہ بولی۔ ”بٹیا، ساٹھ تصویروں میں کام کیا ہے۔ ساٹھ تصویروں میں

ہیروئن رہ چکی ہوں، آتند بالا کا نام نہیں سنا۔“

وہ مسکرانے لگی۔ ”اچھے تاجر ہو۔“ بولی۔ ”خیر مجھے کیا لینا دینا، گھر میں

کھانے پینے کو بہت ہے اس لیے چلی آئی تھی کہ اگر کام اچھا ہو، میرے ٹھہ

کا ہو تو کروں گی، ورنہ — اب یہ چھوٹے موٹے دو سطر دل کے پارٹ

تو مجھ سے کیے نہیں جاتے۔۔۔۔۔ بولو پارٹ اچھا ملے گا۔“

”بہت اچھا۔“

”کتنے سین ہوں گے۔“

”دو کوئی آٹھ دس۔ ٹھیک طرح سے نہیں کہہ سکتا۔“

”کتنے دن کا کام ہے۔“

ایک اسٹراٹجی

”آٹھ دس دن کا کام ہے“

”باس؟“

”بس!“

”اچھا تو کر لوں گی۔ مگر بابا اپنے کتنے دو گے“

”پچھتر روپیہ ماہوار“

”باس؟“

”بس!“

”یہ تو بہت کم ہے بابا۔ میرے بچے ہیں۔ دو لڑکیاں۔ ان کا بیاہ
مجھے کرنا ہے۔ کچھ تو سوچو اور —“

لمحہ اترنے لگا۔ اور جب وہ چلنے لگی تو بالکل ہی اُتر چکا تھا۔

چھٹی لڑکی کا نام زبیدہ تھا۔ جسے گھر والے زیب کہہ کر پکارتے تھے۔
خیر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، وہ کنواری تھی، کم از کم اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔
زبیدہ کا جسم جوان تھا، اُس کی آنکھیں جوان تھیں، اُس کے ہونٹ جوان
تھے، اس کی مسکراہٹ جوان تھی، اُس کا ماتھا گھٹا ہوا تھا، اس کی ناک میٹھی

ہوئی تھی، اس کا رنگ کالا تھا، وہ ایک ایسی لٹکی تھی، جو بد صورت ہوتے ہوئے بھی بد صورت نہ تھی اور خوبصورت ہوتے ہوئے بھی خوبصورت نہ تھی، اُس کے جسم کے خطوط میں، اور اُس کے آہنگ میں، اور اُس کے نغصے میں شمال اور جنوب کے قطبین کی آمیزش تھی، آریائی خون در اوڑ جلد میں لہریں لے رہا تھا، اور در اوڑی جدت آریائی برف کو پگھلا کر اسے پانی کی طرح پگھلا رہی تھی، اس وجہ سے تو زبیدہ کے جسم کا اور اس کی روح کا صحیح تجزیہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اک مسلسل تجربہ تھی، جسے دو نسلیں، دو تہذیبیں، دو زمانے، ایک سانچے میں کھولا ہے تھے، اسی لیے تو وہ خوبصورت تھی نہ بد صورت، جوان تھی نہ بڑھیا، کالی تھی نہ گوری، آریائی تھی نہ در اوڑی، کبھی تو اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن معلوم ہونے لگتیں اور وہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی، دوسرے لمحے میں اس کی آنکھیں چھوٹی اور اُس کا ماتھا گھٹا ہوا معلوم ہوتا۔ کبھی تو اُس کی جلد میں آریائی اُجلا پن نظر آتا، دوسرے لمحے میں کالی ناگن کی سیاہ لطافت اُس کی جلد میں عود کر آتی، اور بیٹھی ہوئی ٹناک کے نتھنے خوفناک پھنوں کی طرح پھٹرکنے لگتے۔

ایک کسٹرائڈ کی

”زبیدہ۔ کہاں کی ہنسنے والی ہو“

”بھبی کی“

”باپ کیا کام کرتا ہے“

”ایک سوڈا واٹر کی دکان ہے اس کی، اور میری ماں ایک پارسی

کے ہاں ملازم ہے“

”اور انھیں تمھارے — میرا مطلب ہے — اگر تم —

فلم میں کام کرو تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا“

”مطلق نہیں صاحب!“

”تم اردو بہت اچھا جانتی ہو“

”شکریہ۔ مجھے غزلوں کا بہت شوق ہے۔ میرا باپ بڑا عالم

فاضل ہے۔ میرے پاس مینائی، جگر، غالب، داغ سب کے دیوان موجود ہیں۔“

”جوش کا کلام دیکھا ہے“

”نہیں“

”کرشن چندر کے افسانے پڑھے ہیں“

”نہیں، مجھے افسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بس غزلوں کا شوق ہے،“

ایک اکسٹرا لڑکی

داغ آہا۔ کیا کہتا ہے۔ اور جگر! واہ واہ“

”تم نوکری کیوں کر ناچا ہتی ہو؟“

”مجھے فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے“

”فلم میں کام کرنا جان جو کھوں کا کام ہے“

”واہ۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ میک آپ کیا اور کیرے کے سامنے

آگئے وہ۔ اس میں کیا مشکل ہے۔“

”کبھی کام کیا ہے“

”نہیں۔ مگر شوق ہے مجھے غزلوں کا بڑا شوق ہے آپ غزلیں کہتے ہیں؟“

”نہیں۔ میں غزلیں نہیں کہتا۔ سننا ہوں۔ سناؤ گی؟“

”واہ۔ میں غزلیں کیوں سناؤں گی بھلا میں شعر تو نہیں کہتی۔ و مورو

کے کہے ہوئے پڑھتی ہوں۔ مجھے تم کوئی پارٹ دونا۔ کیا نام ہے تمہارا۔“

”جانی وا کر“

”جانی وا کر! چھی چھی چھی۔ جانی وا کر بڑا برا نام ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ یہ ایک شراب کا نام ہے۔ اچھے آدمی شراب نہیں

ایک اسٹارٹر کی

پیتے۔ مجھے جگر کی غزلیں بہت پسند ہیں۔
”جگر شراب نہیں پیتا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“
”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“

”مجھے متاب نے بتایا تھا میں ایک روز متاب سے ملنے گئی تھی، بچاری
اچھی طرح ملی۔ چائے پلائی، اتنی بڑی ایکٹرس ہے وہ، پر غرور — چھی چھی چھی
— نہ جانے بڑی بڑی فلم ایکٹرسوں کو غرور کس بات کا ہوتا ہے۔ کیوں
جی؟ اور میں نے دیوکارانی کو ٹیلی فون کیا اُس نے جواب نہیں دیا۔ کیوں جی؟
یہ کیا بات ہے۔ واہ۔۔۔۔۔“

میں اُس کی ساڑھی کی طرف دیکھنے لگا۔ دھوبی کے ہاں دھلی ہوئی
تھی۔ سفید وائل کی ساڑھی، جس پر طاؤسی نقش و نگار کا بارڈر تھا۔
میں نے کہا۔ ”بارڈر اچھا ہے۔“

وہ بولی۔ ”شکر یہ۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔“
میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہے۔ جگر نے بتایا تھا کہ متاب
نے، کہ دیوکارانی نے۔“

ایک اسٹراٹجی کی

وہ بولی ”چھی چھی چھی۔ ایسی باتیں کرتے تھے آپ کو شرم نہیں آتی“ یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہات پر رکھ دیا ”لائیے میں آپ کا ہات دیکھوں۔“ میں نے اپنا ہات اُس کے ہات میں ڈے دیا۔ دونوں ہاتھوں میں بہت سی باتیں ہوئیں، محبت کی باتیں، وصال کی باتیں، جسم کی لذت کی باتیں ہمیشہ زندہ اور جوان ہونے کی باتیں، سب جھوٹی باتیں، میں بھی سمجھتا تھا، وہ بھی سمجھتی تھی ”خراکتا کر کہنے لگی۔“ مجھے نوکری چاہیے۔“

میں نے کہا ”میں نے تمہارا پٹا نوٹ کر لیا ہے اور۔“

وہ بولی ”مجھے کل تک جواب دو۔“

اس کے بعد وہ دوسرے دن آئی تیسرے دن وہ آئی۔ چوتھے دن وہ آئی، پندرھویں دن وہ آئی۔ ہر بار اس کے ہات میں اک نئی کتاب ہوتی، کسی پرانے شاعر کا کلام، مطبع نوکشنور، لکھنؤ، پرانی کتابیں جن سے سونڈھی سونڈھی خوشبو آتی تھی، پرانے کاغذوں کی خوشبو، پرانے زمانوں کی پرانی جوائیوں کی، پرانے آنسوؤں کی خوشبو، اور ہر بار اُس کے بدن پر وہی سا لہجہ ہوتی، دھوبی کے ہات سے دھلی ہوئی اور وہی طاؤسی بارڈر، اور وہی غزلیں، بار بار پڑھ کر مجھے سناقتی تھی وہ، اور ہر روز نوکری کے لیے التجا

ایک اکسٹرا لڑکی

کرتی۔ یونہی، باتوں باتوں میں سرسری طور پر، ایک دفعہ کہہ دیتی، اور پھر دیوان کے ورق اُلٹ کر مجھے سنانے لگتی، جیسے نوکری سے زیادہ ان شاعروں کے عشق ہے۔

ایک دن میں نے کمپنی کے مالک سے کہا: ایک اکسٹرا لڑکی آتی ہے نام ہے زبیدہ، تلفظ اچھا ہے۔ گونا گ میں بولنی ہے، مگر چل جائے گی۔“
”شکل و صورت کیسی ہے“

”بس یونہی جیسے اکسٹرا لڑکیوں کی ہوتی ہے، مگر ذہن معلوم ہوتی ہے اس کا باپ بڑا عالم فاضل“ ہے اس کی ماں اک پارس کے ہاں ملازم ہے۔“
”کون ہے وہ؟“

میں نے کہا۔ ”طوائف تو نہیں معلوم ہوتی۔ نیم طوائف شاید۔“
”جہانے دو“

میرے انکار کرنے کے بعد بھی وہ آتی رہی۔ کسی نے اُسے بتایا کہ سعید اُسے نوکر کر سکتا ہے۔ وہ سعید کے پاس گئی، کسی نے اُسے بتایا کہ جمیل سے اس کا کام ہو سکتا ہے، وہ جمیل کے پاس گئی، کسی نے بتایا کہ لال اس کا کام کر دے گا، وہ لال کے پاس گئی۔ اور پھر ہر پھر کو میرے پاس آئی۔ اب

ایک اکسٹرالٹ کی

وہ سارے سٹوڈیو میں بدنام ہو چکی تھی، کیونکہ وہ نوکر ہونا چاہتی تھی۔ اور اے
نوکر ہی اصل کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ وہ اس بے حیائی کے انداز میں کہہ رہی تھی
مجھے لے لو — مجھے لے لو — کہ کوئی اُسے لینے کے لیے تیار نہ تھا۔
میں نے اُسے دیکھتے ہی تیوری چڑھالی۔ میں اس کی مسلسل آمد و رفت
سے عاجز آچکا تھا۔ اور اُس سے چٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”زیب!“

”جی!“

”تم گھر جاؤ اور یہاں کبھی نہ آؤ“

”بہت اچھا“

”جب تمہاری ضرورت ہوگی تمہیں بلالیا جائے گا“

”بہت اچھا“

”زیب!“

”جی!“

”تمہارا اس طرح خوشامد کرنا مجھے....“

میرا فقرہ ناتمام رہ گیا۔ کیونکہ وہ رو رہی تھی۔

ایک اکڑالو کی

وہ روتی رہی اور میں میز پر بیٹھا ہوا اپنی انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا۔
جب وہ چپ ہو گئی تو مسکرا کر کہنے لگی۔ ”یہ شعر آپ کو پسند ہے۔“

زندگی یوں بھی گزر رہی جتنی
کیوں تیسرا رکندریا د آیا“

میں نے کہا۔ ”غالب کا شعر ہے!“
وہ بولی۔ ”اور مجھے یہ شعر بھی بہت پسند ہے۔“

ہم نے بھی وضع غم بدل ڈالی
جب سے وہ طرزِ التفات گئی“
میں نے کہا۔ ”جگر کا شعر ہے“

وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں۔ خدا حافظ“
”خدا حافظ!“

زبیدہ چلی گئی۔ اُس نے اپنی وضع غم بدل ڈالی، اب وہ ایک فلمی
دلال بادی کے پاس ہے، بادی اسی سے ایک بہترین فلم ایکٹرس بننے کے
سلسلے کو لازم ہم پہنچا رہا ہے، اب تک تین چار لڑکیوں کو فلمی ستارے بنا چکا ہے

ایک اکسٹر لڑکی

بادامی ہر سال ایک لاکھ روپیہ انکم ٹیکس ادا کرتا ہے، اس کا کام ہے نئی لڑکیوں کو فلم ایکٹرس بنانا اور پھر انھیں بیچنا۔ وہ کتنا ہے یہ بڑی اچھی تجارت ہے، ملک میں یہ تجارت اب پانچویں نمبر پر ہے، بادامی نے زبیدہ کو زندگی کے نازک ترین مرحلے سے بخیر و عافیت گزر جانے کا موقع دیا۔ وہ اس کے لیے سکر گزار ہے، اس سال زبیدہ بادامی کے ساتھ سندھ اور پنجاب میں ایک ناچ پارٹی میں دوڑے پر جا رہی ہے پچھلے سال بادامی نے اسی دوڑے میں تین لاکھ روپیہ کمایا تھا۔ اب زبیدہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہے۔

زبیدہ اگلے سال فلم سٹار بن جائے گی۔ پھر وہ اپنی آمدنی کا تیس فیصدی بادامی کی نذر کیا کرے گی، کالج کے لڑکے اس کے گھٹے ہوئے ماتھے، بیٹھی ہوئی ناک، اور گنگنے اندازِ تکلم پر قربان ہوا کریں گے، اور اس کی تصویریں اپنے البم میں سجائیں گے، اور چاندنی راتوں میں آہیں بھریں گے۔ اور جس کمپنی کے مالک نے اسے اپنے ہاں پچتر روپے کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تھا وہ اب اسے دس ہزار روپے دے کر اپنی نئی تصویریں کام کرنے کی دعوت دے گا۔

اور اخباروں میں زبیدہ کی تصویریں چھپیں گی، اور لوگ اُسے گالیاں دیں گے اور لوگ اسے بے وفائی، ننگ انسانیت کے حوصلہ افزا خطابات سے

ایک اسٹرا لٹ کی

نوازیں گے۔

یہ سب کچھ ہوگا اور بہت کچھ ہوگا اور خوب ہوگا، اور محض اس لیے ہوگا کہ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا اور ایک طوائف کو جہنم دیا گیا تھا۔ گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میں نے اور تم نے سوچ کو ڈوب جانے دیا تھا اور تاریکی کو بچا لیا تھا، گیارہ دسمبر ۱۹۴۴ء کی دوپہر کو میرے اور تمہارے سامنے ایک حرفِ سوالیہ آیا تھا۔ اور اس کے جواب میں میں نے اور تم نے چھ لڑکیوں کے چہروں پر کیمچر ٹھوپ دی تھی۔

کیونکہ زبیدہ ایک لڑکی نہ تھی، وہ چھ لڑکیاں تھیں، چھ نہیں بلکہ سات، کیونکہ ان باتوں میں وہ زبیدہ یعنی وہ زیب بھی شامل ہے جس کا اس کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔

پھانسی کے سائے میں

زندگی کے آخری لمحے کیوں بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ محض جینا ہی کافی ہے۔ محض جینا ہی خوبصورتی ہے،..... مجھے فیروز ڈاکو کے آخری لمحے یاد آتے ہیں۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا، اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوست کے ماں رام گڑھ جارا تھا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بہت بھیڑ تھی، بڑی مشکل سے مجھے کھڑے ہونے کی جگہ ملی، لمبا سفر تھا کئی گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے، میرے قریب کی بیچ پر دو ننھی ننھی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا بھائی جس کی عمر بمشکل آٹھ نو سال کی ہوگی، ان سے پرے ان کی ماں بیٹھی تھی، اس سے پرے پھر دو لڑکے بیٹھے تھے۔

پھانسی کے سائے میں

ان کے کپڑے صاف تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی ٹمبل کی ٹوپیاں، ان کے ساتھ ان کی ماں بیٹھی تھی، ادھیڑ عمر کی لالائیں، جس نے ایک میلے رنگ کی ریشمی دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا گول چہرہ متین اور غمگین نظر آتا تھا۔ دونوں لڑکے سمٹ کر الگ بیٹھے تھے، اور کبھی کبھی اُن دونوں ننھی ننھی لڑکیوں کی ماں کو دیکھ لیتے، اُن کے چہروں پر غم و غصہ اور خوف کے جذبات ہرید ہرید ہوتے اور پھر وہ اپنا چہرہ پرے کر لیتے اور اپنی ماں کا آنچل پکڑ لیتے ننھی لڑکیوں کی ماں کا چہرہ فٹ تھا۔ اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے، او وہ انہیں کالے رنگ کے کھدر کے دوپٹے سے پونچھ لیتی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی، اس کا لڑکا اپنی ننھی بہنوں کو میٹھے نوسوا اور کھٹے پچا اور گندیریاں راستے کے مختلف اسٹیشنوں سے خرید کر کھلاتا تھا اور لالائیں کے لڑکے اُسے گھور کر دیکھتے اور پھر اپنی ماں سے کسی چیز کی فرمائش کرتے اور پھر لالائیں اہستہ سے جھبک کر سیدٹ کے نیچے سے ایک ٹوکری کا ڈھکنا الگ کر کے سیدٹ سنگترے یا کیلے نکال کر اپنے بیٹوں کو دیتی اور وہ اک نانا تانہ انداز سے ان دو لڑکیوں کے بھائی کی طرف دیکھتے اور مزے سے پھل کھانے میں اور اسے دکھا دکھا کر کھانے میں

پھانسی کے سائے میں

مصروف ہو جاتے۔

ابھی رام گڑھ بہت دور تھا۔ اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے قریب کی بیچ پر بیٹھی ہوئی ننھی لڑکی سے التفات ظاہر کیا۔ اُسے ایک دوا سٹیشنوں سے کھانے کے لیے چیزیں بھی خرید کر پیش کیں، بڑی پیاری ننھی سی لڑکی تھی۔ وہ بہت جلد میری گود میں آگئی اور میں آرام سے اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میری ناک سے کھیلنے ہوئے کہا ”تم کدھل جا رہے ہو!“
میں نے کہا ”میں رام گڑھ جا رہا ہوں۔“

ننھی نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا ”اماں! یہ ام گڑھ جا رہا ہے۔“
ننھی کی ماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب بیٹھی ہوئی لالائٹن اور اس کے دونوں لڑکوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور پھر کسی نے مجھ میں دلچسپی لینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف میری گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہی مجھے حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور خوشی، میں اس کا ساتھ تھا۔ ہم دونوں رام گڑھ جا رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا ”تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟“

پھانسی کے سائے میں

وہ بولی ”فیروز!“

میں نے پوچھا ”تمہارے آبا رام گڑھ میں ہیں؟“

وہ بولی ”ہاں میرے آبا ویل میں ہیں۔“

”ویل میں؟“ میں نے پھر پوچھا۔ اس کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی،

اب دو چار اور لوگ بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

”ہاں۔ رام گڑھ ویل میں؟ کل اُن کو پھانسی ہوگی!“ لڑکی نے

نہایت اطمینان سے گنڈیری چوستے ہوئے جواب دیا۔

”جیل؟ پھانسی؟“

یہ ایک جیسے سارے ڈبے میں سناٹا چھا گیا میں نے لڑکی کی اماں

کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنا چہرہ اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا تھا

اور سسکیاں لے رہی تھی، اس ڈبے کی خاموشی میں وہی سسکیاں پھیلی

جا رہی تھیں۔ لالائے نے اپنے دونوں بچوں کو اپنی چھاتی سے چسٹا لیا۔

سب لوگ خوفزدہ سے ہو گئے تھے، جیسے اس چلتی گاڑی میں کسی نے

پھانسی کا تختہ اُن کے سامنے کھڑا کر دیا تھا اور اپنی گردن اسی رسی

میں دیکھ رہے تھے۔

پھانسی کے سائے میں

”اٹاں۔ اٹاکی پھانسی ہوگی نا!“ لڑکی نے بڑے چاؤ سے اپنی اماں سے پوچھا۔
 اماں نے فوراً اُسے میری گود سے چھین لیا اور زور سے ایک طمانچہ رسید
 کیا اور پھر اسے اپنے کانوں کے دوپٹے میں چھپا دیا۔ لڑکی بہت دیر تک اس کانے
 دوپٹے میں روتی رہی، لالائش اور اس کے بیٹے پر بے سرک گئے، فرش پر
 دو کسان بیٹھے تھے وہ بھی رام رام کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دور
 ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا کھڑے ہوئے اس عورت اور اس کی
 دو لڑکیوں اور اس کے لڑکے کے ارد گرد گاڑی کے مسافروں نے
 ایک نظر نہ آنے والی چار دیواری کھڑی کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی باتوں
 میں مشغول ہو گئے صرف اُس چار دیواری کے اندر فیروز اور اس کی بیوی
 اور اس کے بچے اکیلے رہ گئے تھے۔ اور ایک اجنبی ایک طرف دروازے
 کی دہلیز پر کھڑا تھا اور گاڑی چل رہی تھی۔

اس رات رام گرٹھ سے دس میل باہر سے دوست نے ایک دعوت
 کا انتظام کیا تھا چاندنی رات تھی لیکن چاند آدھے سے بھی کم تھا اس لیے
 چاندنی میں سیاہی اور سیاہی میں چاندنی گھلی ہوئی تھی، ایسی رات عجیب اسرار
 ہوتی ہے زندگی کسی نامعلوم راستے پر دوڑنا چاہتی ہے اور اپنے عزیز ترین

پھانسی کے سائے میں

دوستوں کے چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں، اس محفلِ رقص و سرود میں مجھ
بھی عیب تھا۔ عورتیں بھی اس دلیس کی معلوم نہ ہوتی تھیں، یہ سنسنی بھی فطری
نہ تھی، بچانے غم کا ہلکا سا غبار مجھے فضا میں پیرتا ہوا کیوں معلوم ہوتا تھا۔

میرے دوست نے پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو؟“

”تھکا ہوا ہوں شاید؟“

”اس لڑکی کا رقص تمہیں پسند نہیں؟“

”مجھے نیند آرہی ہے۔“

میرا خیال ہے، میں وہیں اُسی گاؤں کے سہارا لگاٹے سو گیا۔
سوتے وقت صرف اتنا یاد ہے کہ زبان پر شراب کا ہلکا میٹھا ہلکا تلخ ذائقہ
باقی تھا۔ لڑکی نلچ رہی تھی۔ گھنگھروں کی صدا میں اس کی جوان آواز پگھل
پگھل کر کہہ رہی تھی:-

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا

میرے دوست نے مجھے تھنجھوڑ کر جگایا۔ موڑ بھاگتی جا رہی تھی غالباً
محفلِ رقص و سرود ختم ہو چکی تھی، اور ہم واپس ام گڑھ جا رہے تھے۔ فضا
میں ایک اُجلاہٹن آ رہا تھا۔ اور بہت سے تاروں کے رنگ ماند پڑ گئے

پھانسی کے سائے میں

تھے، لیکن دو ایک ننادوں کے رنگ نکھر رہے تھے، یکایک ایک تارہ
بہت ہی روشن اور حسین نظر آنے لگا۔ دور کہیں مرغ بولا۔ اور پھر گھڑیا
نے پانچ بجائے۔

میرے دوست نے کہا: ”مجھے کیا معلوم تھا تم اتنے تھکے ماندے
رام گڑھ پہنچ گے، میں نے یہ دعوت تمہاری خاطر منعقد کی تھی اور تم
— سوتے رہے!“

میں نے جاتی لے کر کہا: ”بھئی معاف کرنا۔ میرے پاس پیسے بالکل
نہیں تھے۔ کیمخت کبھی نہیں ہوئے۔ تھرڈ میں آیا۔ اب تم ہی بتاؤ۔“
”تھرڈ میں؟ لا حول ولا یجی ریس اندھا دھند نہ کھیلا کرو۔“
”کون چند ریس کھیلتا ہے، وہ تو یوں سمجھو کہ — اچھا تو یہ بتاؤ
کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”جیل جانے میں!“

”جیل خانے میں؟“

”ہاں۔ تمہیں ایک عجیب تماشہ دکھلائیں گے۔ کبھی پھانسی
دیکھی ہے تم نے؟“

پھانسی کے سائے میں

ٹن!

گھڑیال کی آخری گونج میرے خون کی مدھم روانی میں مل گئی اور پھر اس نے میرے خون کے ذرے ذرے کو چوکا دیا، ٹن ٹن ٹن، میرے خون کا ہر ذرہ اس صدا سے گونجنے لگا، اور روانی بڑھتی گئی، اور مجھے اپنا کلا گھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن خون خود بول رہا تھا۔ اس نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنا حلقوم سہلانے لگا۔

”شوفر تمہیں معلوم ہے۔ پھانسی کس وقت دی جائے گی“

”ساٹھے پانچ بجے حضور۔“

”دراکڑی تیز چلاؤ۔“

ساٹھے پانچ میں چند منٹ باقی تھے۔ جب ہم جیل خانے کے پھانک کے اندر داخل ہوئے اور کار کو گھما کر اُس طرف لے گئے، جہاں پھانسی کھڑی تھی، یہاں جیل کے ملازمین اور ڈاکٹر، اور چند افسر لوگ جمع تھے، ایک چھوٹے سے میدان میں پھانسی کھڑی تھی۔ دو لمبے لمبے سیاہ کھیمے ایک اندھے کنوئیں کے دونوں طرف کھڑے تھے، اور اس اندھے کنوئیں کے اوپر لکڑی کا ایک تختہ بچھا تھا، اس پر بھی سیاہ رنگ

پھانسی کے سامنے میں

کیا ہوا تھا، اور دونوں کھمبوں کے درمیان جو دو لوہے کے تار تھے ان کا رنگ بھی سیاہ تھا اور ان دونوں میں ڈبڑھ دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ دونوں تار ایک دوسرے کے متوازی دونوں کھمبوں کے بیچوں بیچ چلے جاتے تھے، میدان کے چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر کانچ کے تیز ٹکڑے لگے تھے اور ان سے پرے شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آتی تھیں۔ آسمان اب ابر آلود ہو گیا تھا۔

ہم بھی ڈاکٹر کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، وزیر صاحب کے لڑکے کو دیکھ کر دو ایک افسروں نے ہمیں سلام کیا، چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے، قریب کی دیوار کا سایہ ایک سیاہ بامے کی طرح تماشائوں کے چہروں پر پھیلا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔ چند لوگ سگریٹ پی رہے تھے، سگریٹ کا دھواں اور گرم گرم سانس کا دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے آسمان پر روشن ستارے کو ڈھونڈا، جیسے بچہ خواب میں ڈر جانے پر اپنی ماں کی چھاتی ڈھونڈتا ہے، لیکن مطلع ابر آلود ہر چپکا تھا اور اب تو ملکی، ملکی بارش بھی شروع ہو گئی، کالی کالی دو چار چھتریاں کھل گئیں،

بھانسی کے سائے میں

لیکن بارش بالکل معمولی سی تھی، جیسے ہلکی ہلکی اوس گر رہی ہو۔ ستارہ کہیں
نظر نہ آیا۔

میں نے ناامید ہو کر اپنے دوست سے کہا ”چلو چلیں“
وہ بولا ”بڑے بزدل ہو۔ یہ منظر تمہیں زندگی بھر اور کہیں دیکھنا
نصیب نہ ہوگا“

کہیں لوہے کا ایک پھاٹک کھلا، پھر سفید اُجھلے کپڑے پہنے ہوئے
ایک درمیانے قد کا آدمی بھانسی کی طرف چلتا ہوا نظر آیا۔ اس کا سر منڈا ہوا
تھا اور چہرے پر چھدری سی داڑھی تھی۔ وہ بالکل ہمارے قریب سے
گزرا۔ اس کا چہرہ سپید اور سستا ہوا تھا اور اس کے ہات پیچھے پیٹھ پر
بندھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب ایک لمحے کے لیے رکا اور اپنے
پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر بھانسی کے کالے کھمبوں کی طرف اشارہ
کر کے بولا۔

”وہ آگئی۔ میری جان لینے والی“

اس کی مسکراہٹ میں کسی مردنی تھی، اس کی آواز میں کسی تھر تھرا
ہٹ، جیسے اُس زندہ جلد میں ہوتی ہے، جیسے چھری کی تیز دھار ذبح کرنے

پھانسی کے سلسلے میں

کے وقت چھوٹے، اس کی چال میں کسی اکھڑی اکھڑی سی جھجک تھی، جیسے وہ اپنی ٹانگوں سے نہیں لکڑی کی ٹانگوں سے چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بہادر آدمی تھا، دلیر آدمی تھا اور بغیر کسی سہارے کے پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا اور خدا کا نام لینے لگا، بلند، صاف، یقین آمیز آواز میں.....!

وہ کس طاقت کو بلا رہا تھا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ ”جلاؤ کہاں ہے؟“

جیسے میرے سوال کا جواب دینے کے لیے ایک آدمی ایک لمبا سفید کوٹ اور پتلون اور سیاہ بوٹ پہنے ہوئے لگے بڑھا۔ اور پھانسی کی طرف چلتا گیا، اُس کے سر پر سفید گپٹری تھی، اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا دائیں بات کے کھمبے کے قریب کھڑا ہو گیا، اور اس نے اپنا مات لہے کی پھر کی پر رکھ دیا۔ جس پر ریشمی ڈوری بندھی تھی اس کے دوسرے بات میں ایک سفید کپڑے کا غلاف تھا۔

میرے دوست نے کہا۔ ”پرانے زمانے گئے۔ آجکل تو جلاؤ بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں کسی قاتل کا خون معاف کر دیا جاتا تھا۔ اور وہ اس کے عوض میں سزا کا ریشمی جلاؤ بنا دیا جاتا تھا۔ حقیقت

پھانسی کے سائے میں

یہ ہے کہ اس قاتل کو اسی لیے معاف کیا جاتا تھا۔ اسی شرط پر کہ وہ بکری جلا دین جائے۔

”اور اب؟“ میں نے پوچھا

”اب معاملہ دوسرا ہے، اب تو قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ محض جلا دینے کے لیے کسی کا خون معاف کر دیا جائے، اور عام طور پر لوگ جلا دے پیشے کو.... میرا مطلب ہے، اچھا نہیں سمجھتے؟“

”وہ کیوں؟ ہم قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی قتل کرے اُسے پھانسی کی سزا بھی دیتے ہیں۔ پھر جلا دے پیشے میں کیا برائی دیکھتے ہیں۔ کیا کہیں انسانی ضمیر کے اندر کوئی پھانس رہ جاتی ہے؟“

”جلا دے پیشے کے لیے ہمیں امیدوار نہیں ملتے، درآغالیہ ریاست میں اس کے لیے تنخواہ بھی اور گریڈ بھی، اور ترقی کا انتظام بھی خاطر خواہ موجود ہے، پھر بھی.... جلا دینے کے لیے کوئی راضی نہیں ہوتا۔ اور اب تو جلا د کا کام بھی اس قدر آسان ہو گیا ہے۔ بس چند لمحوں کی بات ہے....“

میرا دوست کہہ رہا تھا۔ اب فیروز کی پھانسی کے لیے بھی کوئی جلا د نہیں ملتا تھا۔ بہتری کو شمش کی۔ انویہ آدمی راضی ہوا۔ یہ اسی جیل میں

پھانسی کے سائے میں

کمپونڈ رہے، دو ایک مرتبہ خود بھی رشوت ستانی کے جرم میں قید ہو چکا ہے
مریضوں کو سیٹھنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور زخموں کی چیر بھارتیں تو
اس کا مقابلہ اور کوئی کمپونڈ نہیں کر سکتا۔“

یہ ایک فیروز نے پوچھا۔ ”میرے تارکا کوئی جواب آیا؟“
ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”مجھے افسوس ہے، فیروز، تمہارے تارکا کوئی
جواب نہیں آیا۔“

رحم کی آخری درخواست بھی ٹھکرا دی گئی تھی۔
”تم اپنے بیوی بچوں سے مل سکتے ہو۔“

یہ ایک لڑکے کا دروازہ پھر کھلا۔ اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں
دونوں کے ساتھ بچے تھے، دو ننھی لڑکیاں اور ایک لڑکا اور ایک کالا
دوپٹہ اوڑھے ہوئی عورت، دوسری عورت کے ساتھ دو لڑکے تھے جنہوں
نے چھوٹی چھوٹی سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ دوپلی ٹوپیاں۔
دائیں کھبے پر کالے دوپٹے والی عورت کھڑی ہو گئی، بائیں کھبے پر
وہ لالٹن اور اس کے لڑکے۔

”یہ کیا تماشہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

پھانسی کے سائے میں

میرے دوست نے جواب دیا: ”وہ لالائیں مقتول مہاجن کی بیوی ہے
وہ اس کے دونوں لڑکے ہیں۔“

فیروز نے منہس کر کہا: ”چھوٹے شاہ جی، اپنے باپ کے قاتل کی پھانسی
دیکھنے آئے ہو۔“

میں نے کہا: ”یہ انتہائی ظلم ہے، ان لوگوں کو یہاں نہ آنے دینا چاہیے۔“
میرا دوست بولا: ”پہلے تو اس ریاست میں کیا ساری دنیا میں ہرگز
پھانسی دی جاتی تھی تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو۔“

”چھوٹے شاہ جی کا اب کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔“ فیروز نے تلوار کی دھار
کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

دائیں طرف اس کی بیوی اپنے بچوں کو لیے کھڑی تھی۔ لیکن فیروز
نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ عورت اس کی طرف تکی گئی، اور فیروز،
لالائیں اور اس کے بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔

ایکایک ننھی لڑکی نے مات پھیلائے اور کہا: ”ابا!“

”ابا!“

”ابا!“

پھانسی کے سائے میں

فیروز نے ایک لمحے کے لیے شمال مشرق کی طرف مڑ کر دیکھا۔ لیکن
روشن ستارہ کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی
ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا: ”یہ انتہائی ظلم ہے۔ ان بچوں کو یہاں
آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔“

لڑکی نے کہا: ”ابا..... ابا..... ابا!!“

فیروز نے آہستہ سے جلا دے کہا: ”مجھے جلدی سے غلاف اٹھا
دو میں اپنی بچیوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

میرے دوست نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا۔ اس نے
حکم دیا کہ اب دونوں عورتوں اور ان کے بچوں کو دھان سے پرے ہٹا
دیا جائے۔

لوہے کا پھانک ایک بار بچہ کھلا اور لالٹن اور اس کے دونوں
بیٹے باہر چلے گئے۔ فیروز کی بیوی ایک بارڑکی، مڑی اور چیخ مار کر اپنے
خاوند کی طرف بڑھنا چاہتی تھی، کہ پہرہ داروں نے اُس کے منہ پر مات
لکھ دیا اور اُسے لوہے کے پھانک کے باہر دھکیل کر دُور کہیں جیل خانے

پھانسی کے ساتھ میں

کے دوسری طرف لے گئے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساٹھ پانچ بجنے میں چارمنٹ باقی تھے۔

”تم کچھ کمنا چاہتے ہو فیروزا ڈاکٹر نے پوچھا۔

”دعا کرو۔ میرے لیے دعا کرو۔ سب لوگ میرے لیے دعا کرو۔“

فیروز کی آواز اس غلاف کے اندر سے اس طرح آرہی تھی، جیسے وہ کسی

تاریک اندھے کنوئیں میں بول رہا ہو۔“

جلاد نے ریشمی ڈوری کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور پھندے

کی کانٹھ کو اس کے گلے میں فٹ کر دیا! انصاف کی رسی!

فیروز زور زور سے اور تیزی سے اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔

وہ کس طاقت کو بلارہا تھا!

ایک منٹ گزر گیا۔

دوسرا منٹ گزر گیا۔

تیسرا منٹ گزر گیا۔

چوتھا منٹ گزرا۔ ٹن اہل خانے کے گھڑیاں نے بجایا۔ گونج

فضا میں تھرانے لگی۔

پھانسی کے سائے میں

ڈاکٹر نے سفید رومال ہلایا اور دائیں کھمبے کی پھر کی ہلی، اور پھانسی کا تختہ بیچ میں سے شق ہو گیا، اور وہیں اُسی لمحے فیروز ہماری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا، وہ اب ان دونوں تختوں کے نیچے اندھیرے کنوئیں میں اُسی لاشمی ڈوری سے لٹکا ہوا آدم توڑ رہا تھا۔

صرف چند سیکنڈ کے لیے لاش تڑپی، جس طرح بجلی کا تار جسم سے چھو جائے۔ ایک سیما کی اضطرابی حرکت، کرب اور بے چینی، اور مہیب اضطراب، جیسے لاکھوں ٹن پانی کا طوفان بیک ایک جہاز سے ٹکرا جائے، جیسے ریلیٹا ہو لاوا ایک ایک کسی آتش فشاں چوٹی سے پھٹ پڑے اور فضا میں آگ ہی آگ برساتے، جیسے خون کی ہر بوند میں اور دماغ کی ہر نرس میں بارود کا فلینٹ بیک ایک بھک سے اڑ جائے، نہیں، جب بھی نہیں، اس تڑپ، اس اضطراب، اس کرب کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے، جب روح اور جسم اس طرح زبردستی ایک دوسرے سے جدا کیے جاتے ہیں۔ وہ اضطراب، وہ حرکت، وہ تڑپ، بجلی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح میری روح کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مارتے دیکھا۔ اپنے ایمان کو خاکستر ہوتے دیکھا، اپنے تہذیب و تمدن کو خشتی

پھانسی کے سائے میں

کی طرح جلتے ہوئے دیکھا، وہ انسان، وہ اس کا خدا، وہ اس کی تہذیب جس نے اس پھانسی کو روا رکھا ہے۔ جس نے خون کا بدلہ خون میں لینا چاہا ہے۔ کبھی پنپ نہیں سکتے، کبھی اٹھ نہیں سکتے۔ کبھی بلند نہیں ہو سکتے۔ فیروز کی صورت یاد نہیں۔ ہاں یاد کے ہر کونے میں پھانسی کا ایک تختہ دیکھتا ہوں، جس پر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس صورت دیکھتا ہوں اس کا چہرہ غلاف کے اندر ہے اور اس کے بازو پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔

یہ صورت، جب بھی اکیلا ہوتا ہوں، میرے سامنے آتی ہے اور ایک خاموش طعنہ بن کر مجھ سے پوچھتی ہے، مجھے جانتے ہو میں انسان ہوں۔ نیکی اور بدی کا پتلا، ازلی، ابدی انسان، تم نے مجھے اک ریشمی ڈور سے اندھے کنوئیں میں لٹکا رکھا ہے، کیا مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔

بھوت

بارش ہو رہی تھی۔ گزشتہ پانچ روز سے متواتر موسلا دھار پانی برس رہا تھا۔ بادلوں کا رنگ دھواں دھواں تھا، اور زمین مچل، پانی میں بھگی ہوئی سبز مچل جس پر پاؤں پھسلتے تھے اور پانی کے بلبلے ہنتے اور پھٹتے تھے۔ فضا میں گرتی ہوئی بوندوں کا اندوہناک شور تھا اور سڑی ہوئی مٹی کی باس۔ مینڈک پانی کی وقتی جھیلوں میں ٹراتے تھے۔ ایک بہت بڑا بھوئے رنگ کا مینڈک ان کے سامنے سے پھدکتا اور ریل کی پٹری کو پار کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ سگنل والے کی کوٹھڑی کے پاس ایک بھینس چر رہی تھی، مینڈک اس کے پاؤں تلے آگیا۔ حادثہ، اتفاق، خدا، کسی کو کیا کہیے۔ زندگی موت

میں مبتدل ہو چکی تھی۔

گاڑی آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ اس نے ٹکٹ خریدا، چھاتا کھولا۔ چنے والے سے چنے کھائے، اخبار پڑھا۔ بوٹ پر پالش کرایا۔ سر کھجایا۔ اٹھ کر ٹہلا۔ ٹہل کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مصنفاتی اسٹیشن تھا۔ بمبئی سے انیس میل دور، اور یہ انیس میل۔ اس وقت ہزاروں میل معلوم ہو رہے تھے، پلیٹ فارم کی گھڑی کی سوئیاں گویا مدت سے ساکن تھیں۔ شاید یکمخت بھی گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں۔ اُس نے جمائی لی۔ ادھر ادھر دیکھا، کہیں کوئی خوبصورت عورت بھی تو نہ تھی۔ نگاہ کہیں نہیں رکتی۔ لوہے کے زنگ آلود تاروں پر کوڑے ٹھٹھڑ رہے تھے۔ نم آلود بچوں پر کائنات کی بد صورت زریں مخلوق بیٹھی ہوئی پان کی جگالی کر رہی تھی، مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ رانیں سہلا رہی تھی۔ چنے کی خشک دال میں ہکا بھکا نمک اور سرخ مرچ اور نیبو کا رس ڈال کر اپنے دانتوں کی چکی تلے پیس رہی تھی اور بار بار آنکھیں جھپک کر ریل کی چمکتی ہوئی لائن دیکھتے میں مصروف تھی..... گاڑی.... کہیں کوئی گاڑی نہ تھی۔ ریل کی چمکتی ہوئی پٹری دور فضا میں گم ہو رہی تھی۔ اور پانی برس رہا تھا۔ اور مینڈک مڑا رہے تھے۔

اگر وہ پانچ منٹ پہلے آجاتا تو پوری دلی سے آنے والی گاڑی پر سوار ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب چھ بج چکے تھے۔ اور اُسے دوسری گاڑی کا انتظار تھا جو پونے سات بجے آئے گی۔ اُس نے چھانا اُلٹا کر اسٹیشن کے ایک کھمبے سے لگا دیا اور قریب ہی ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ”فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی عورتوں کے لیے“۔ اول تو اُسے پلیٹ فارم پر پہلے اور دوسرے درجہ کی ایک عورت بھی نظر نہ آئی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کے بچوں پر عورتیں اور عورتوں کے بچے پر مرد بیٹھے تھے۔ اس نے سوچا اس مرد میں بھی کس قدر دم کا پہلو نمایاں ہے۔ لیکن کمبخت اسٹیشن ماسٹر کو اپنی پتلون کی نوک پلک درست کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ پلیٹ فارم کا اخلاق کیسے سمجھ سکتا ہے۔ چھاتے کی دراز کمانیوں سے پانی ٹپ ٹپ کر کے بہا تھا۔ اور فرش پر بہتا ہوا کچھ لکھتا جا رہا تھا ناگری کے حروف، اردو کے حروف۔ گیدڑ کا منہ شیر کے بال۔ جناح کا چہرہ گاندھی کا جبرہ۔ چرچل کا سگار۔ منہ کی تکیونی چھت جو دیکھتے دیکھتے مسجد کے گنبد میں تبدیل ہوئی اور پھر گاتھک گر جا کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اور پھر ایک عالی شان محل کا کھنڈ رہن گئی۔ قطرہ قطرہ کے پانی بہا تھا۔ اور ایک

بھوت

ہی قلم کی نوک سے مختلف زبانیں، تہذیبیں، شخصیتیں اور مذاہب ایجاد کرتا چلا جا رہا تھا۔ اب چھاتے کی مٹری ہوئی ہوتی تھی کہ نیچے بہت سا پانی جمع ہو کر ایک چھوٹی سی جھیل بن گیا۔ وہ منبع تھا تو یہ منزل ہے۔ اس نے سوچا جہاں سب تہذیبیں اور کلچر اور شخصیتیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ پانی بھی خوب چیز ہے صاحب! ہندو پانی، مسلم پانی اور پھر — چھاتے کا پانی! — گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔

ملاڈ سے چرچ گیٹ تک جانے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔ اس خیال سے اس کی کینٹیاں کھٹکھٹا گئیں اور اسے اسپروکے پکیٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ملاڈ تو ایک فیل مضافاتی اسٹیشن تھا، یہاں اسپرو تو کیا جنجر کی بوتل بھی مہیا نہ ہو سکتی تھی۔ جنجر کی بوتل سے اس کے سر کا درد کیسے دور ہوتا لیکن وہ جنجر کی بوتل ضرور پینا چاہتا تھا۔ دراصل وہ ملاڈ اسٹیشن سے فوراً رخصت ہو جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کی فضا میں برستی ہوئی بارش کی اُداسی تھی اور اینڈک ٹراپے تھے اور غلیظ کوڑے رنگ آلود تاروں پر بیٹھے ہوئے اپنے ناپاک جسموں کو اپنی کالی چونچوں سے صاف کر رہے تھے اور گندے امیر و کبیر مارواڑی دھڑتیلوں سے جوئیں چننے میں مصروف

تھے۔ اور ٹیالی ٹیالی عورتوں نے ایک ہی قسم کے پھول ایک ہی طرح پر اپنے جوڑوں میں لگا رکھے تھے اور سیدھی مانگ نکال کر اپنے بالوں میں کھوپرے کا تیل ٹکا کر انھیں پالش کیے ہوئے بوٹ کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ اور وہ سیدھی مانگ دور سے بالکل ریل کی پٹری معلوم ہو رہی تھی اور گاڑی ابھی تک نہ آئی تھی۔ عورت اور ریل کی پٹری میں کیا فرق ہے۔ اس نے سوچا ریل کی پٹری کئی اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے۔ عورت صرف ایک اسٹیشن پر، اور اگر ایک سے زیادہ اسٹیشن پر ٹھہرے تو عورت نہیں طوائف کہلاتی ہے۔ انتظار دونوں کے لیے کرنا پڑتا ہے اور جو مزہ انتظار میں ہے وہ گاڑی پر چڑھنے میں نہیں عورت تک پہنچنے کے لیے اس سے شادی کرنا پڑتی ہے اور گاڑی کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے اور جو لوگ بے ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ وہ سماجی اعتبار سے بد انسان سمجھے جاتے ہیں۔ گاڑی ہو یا عورت۔ بے ٹکٹ سفر کرنے والے کو ہر حالت میں سزا ملتی ہے تو بے۔ تو بے کیسی بُری بُری باتیں سوچ رہا تھا وہ اس کے کنواں سے جذبات خطرناک حد تک بد اخلاقی کے مرکب ہو رہے تھے۔ اب اُسے ازدواجی زندگی کا ٹکٹ خریدنا ہی پڑے گا۔

بھوت

اب گاڑی آ بھی چکے۔ اُس نے پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے۔ صرف دس منٹ؛ اور وہ اپنی دانت میں کئی عرصے گزار چکا تھا۔ وہ چھٹین سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے میں آیا۔ پھر اپنے بچپن کے سہانے خوابوں کی سمت لوٹ چلا تھا لیکن گاڑی پھر بھی نہ آئی تھی۔ اور ابھی صرف دس منٹ گزرے تھے اس نے پالش والے لڑکے کو آواز دی۔ اے اور لڑکے پالش والے!

پالش والا لونڈا ایک نتھنے میں انگلی ڈال کر گنگنے الفاظ میں بولا:
”صاحب ابھی تو ترابوٹ پالش کیا ہے۔“

”کوئی ہرج نہیں۔ اسے پھر پالش سے اچھی طرح چمکادے دیکھ اب کے اچھی طرح سے پالش کیجو دو آنے دوں گا۔“

پالش والے نے اس کے پاؤں اپنی پھیٹی ہوئی نیکر پر رکھ لیے۔ نیکر جو کبھی خاکی رنگ کی تھی۔ لیکن اب جگہ جگہ سے پھٹ کر بے رنگ ہو چکی تھی۔ پالش والے کی ٹانگوں پر چھوٹے چھوٹے بے شمار زخم اور بھینسیاں تھیں۔ اس کے ننگے پاؤں میں بیائیاں پھوٹ آئی تھیں۔ اور اُس کی ناک سے نزلہ مُٹر مُٹر کر کے بہتا تھا۔ لیکن پالش والا لونڈا بھی برا ہوشیار تھا۔ وہ اپنے

بھوت

بہتے بہتے نہ لے کو ایک ہی بار سانس کھینچ کر فوراً ناک کے اندر لے جاتا تھا تھوڑی دیر کے بعد نزلہ پھر اس کے نتھنوں سے بہنا شروع ہو جاتا۔ وہ سوچتا کہ اب گرا۔ یہ نزلہ میرے بوٹ پر آب گرا۔ لیکن پالش والا لونڈا بڑا ہوشیار تھا۔ اُس نے پھر زور سے سانس لے کر نزلہ کے لعاب کو ناک کے اندر کھینچ لیا اور برش کو زور زور سے بوٹ پر گرٹنے لگا۔ گاڑی پھر بھی نہ آئی۔ شاید یہ گاڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے پالش والے سے کہا۔ بوٹ کے قسمے کھول دو۔ اور بوٹ الگ لے جا کر پالش کرو۔ اس نے سوچا۔ چلو قسمے کھولنے ہی میں کچھ وقت صرف ہوگا۔

گاڑی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ پلیٹ فارم کی گھڑی اس قدر سست کیوں ہے۔ بارش اس طرح کیوں برس رہی ہے۔ کیا یہ اب کبھی نہیں آئے گی! ریلوے والوں نے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے بچوں کے سامنے کھیریل لگا دیے تھے۔ پر دے کے لیے نہیں، بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے وہ ریلوے کا تہ دل سے شکر گزار تھا۔ لیکن اُسے اس وقت کھیریل کی نہیں، ایک گاڑی کی سخت ضرورت تھی۔ جو اسے چند لمحوں میں ملا دے۔ چرچ گیٹ پہنچا دے۔ جہاں اس کی محبوبہ اس کا انتظار

کر رہی تھی۔

چرچ گیسٹ پر اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے اور وہ ملاڈ میں
کلڑی کے ایک گلے سڑے بوسیدہ بیچ پر بیٹھا اپنے جوتوں پر ہالش کر رہا ہے
اور ہالش والے نوٹے کی ناک سے ہنسا ہوا نزلہ دیکھ دیکھ کر خود کشی پر آمادہ ہو
رہا ہے۔ گاڑی نہیں آئی۔ ضرور کوئی حادثہ ہو گیا ہے کوئی کھمبا گرا ہو گا۔ آزاد
پسندوں نے پٹرری توڑ دی ہوگی۔ ریل الٹ گئی ہوگی، یہ گھڑی غلط ہوگی۔
بجلی کے تار فیل ہو گئے ہوں گے۔ سگنل نہ ملا ہو گا۔ راستے میں پل طوفانی اڑ گیا ہو گا۔
سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گاڑی کے سر سے گزر گیا ہو گا۔ ورنہ گاڑی ابھی
تک آگئی ہوتی!

آج فتح کی خوشی میں وہ چرچ گیسٹ جا رہا تھا۔ جہاں نیلا ریشمی سایہ پہنے
اس کی محبوبہ اس کی راہ تک رہی ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ آج اُس نے وہی
نیلا ریشمی سایہ پہنا ہو گا جو اسے بہت پسند ہے۔ اور جس کے دام ابھی
اُس نے دزدی کو ادا نہیں کیے۔ کانوں میں الیکٹرو پیڈ نکل کے آؤنرے
ہوں گے۔ بڑے بڑے ہلالی آؤنرے۔ عید کے چاند کی طرح خوبصورت
لوہان آؤنرے کے بیچ میں موتی ٹکے ہوں گے۔ موتی، آبدار موتی، دکھڑے موتی،

چمکدار موتی، طرح دار موتی.... ایں۔ اُس نے اپنے اُلجھے ہوئے تصور میں اُنہوں
 کو بازاری کتابوں کے ناموں سے کیوں گڈ گڈ کر دیا تھا۔ اس کی محبوبہ تو بازاری نمی تھی
 بے حد شریف لڑکی، نیلا سایہ اور سفید سینڈل پہننے والی لڑکی۔ گوئے گوئے گورے
 چکنے رنساڑوں والی ہنس ہنس کر اُتو بنانے والی لڑکی اور پھرتے پھرتے مگر گرا گھیر کی لفر کی
 نگاہوں سے خراج وصول کرنے والی۔ بے حد شریف کنواری لڑکی ابھی
 لکھتی خاندانی لڑکی، چرچ گیٹ پر اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور گاڑی ابھی اُٹی
 نہ تھی۔ اور راج فتح کا دل تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی۔ اور دنیا نے
 تھک کر امن و چین کا سانس لیا تھا، جرمنی — اور پھر جاپان
 شکست خوردہ ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے اور اُس کی محبوبہ نے نیلا ریشمی
 سایہ پہنا تھا۔ جس میں اُس کا چھریا نازک متناسب جسم کنواری بہاروں
 کی طرح شگفتہ و شاداب نظر آتا تھا۔ دنیا میں بہار اُگئی تھی اور وہ ملاؤ میں
 جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔

آج گاڑی نہیں آئے گی۔ آج وہ فتح کا جشن نہیں مناسکے گا۔ امن کی
 مستروں میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ فورٹ ایریا میں گھومتی ہوئی، قمعوں کے
 جگمگاتی ہوئی ٹراحوں کی روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ ٹیوٹر کراسی کے سپاہیوں

بھوت

کو جام پر جام لٹھکتے اور ابدی امن کے ترانے گاتے نہ سن سکے گا۔
 ناچ گھر میں نیلے سایہ کے محور کے گرد طواف نہ کر سکے گا جو بھوت کے ساحل
 کی لٹھی ریت پر لٹا کر اُس کے ہونٹ نہ چوم سکے گا۔ بس آج وہ جوتے
 پالش کرائے گا۔ اور ناک سے بہتے ہوئے نزلے کو اندر سے باہر اور باہر
 سے اندر جاتے ہوئے دیکھتا ہے گا۔ اور اس کی محبوبہ نا امید ہو کر واپس
 چلی جائے گی اور قہقہے بچھ جائیں گے اور مسکراہٹ بچھ جائے گی۔ اور
 مسرت کے ترانے خاموش ہو جائیں گے اور بھگی بھگی گھاس پر منیڈک
 ٹراتے رہیں گے اور لاہر و ابھینسوں کے پاؤں تلے کچلے درسلے جائیں گے
 بالکل اسی طرح جیسے اب اس کا دل مسلا اور کچلا جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی نہیں
 آئی تھی۔ فرطِ یاس سے مغلوب ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اُس کی نگاہ ایک ٹوکے
 پر پڑی۔ جواب اس کے قدموں کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا جو
 ابھی ابھی یہاں رکھا گیا تھا۔ اس ٹوکے میں مچھلیاں تھیں، ہندری مچھلیاں
 موٹی پتلی۔ اسی سیدھی، چھوٹی بڑی ہر قسم کی مچھلیاں — اور اس ٹوکے سے

بھوت

کے پاس ایک نیم برہنہ انسان بیٹھا تھا۔ جس نے تاڑی پی رکھی تھی۔ اور جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اُس کا سیاہ گٹھا ہوا جسم خوبصورت تھا۔ دانت مضبوط اور سپید، دھڑ سے اوپر ننگا، پاؤں ننگے اور آدھی رانیں بھی ننگی صرف کمر کے اوپر کسی پرانی دھوتی کا چھتھڑا تھا، گیلیا پنڈا، بارش کے پانی سے شفاف ہو گیا تھا۔ کپڑا نہ تھا۔ ایک آئینہ تھا جس میں انسانیت کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ ماہی گیر نہ تھا۔ اس کے خدو خال بھیلوں کے سے تھے آنکھوں میں جنگلی وحشت تھی۔ بازوؤں میں ایک رکی ہوئی جابر توانائی، اعضا میں اک لچک، لونچ اور گھلاوٹ، جیسے وہ کسی مہذب لہتی کا انسان نہ تھا۔ جنگل کا خوبصورت جانور تھا۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لایا تھا۔ اور تاڑی پی کر سنس رہا تھا۔

قریب ہی اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی۔ اور ایک نحیف و نزار بچے کو اپنی گود میں لیے ہوئے تھی۔ اور اپنے تندرست تھنوں سے اسے دودھ پلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں اپنی ناکامی کا ماتم بھی کرتی جا رہی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں سے

بھوت

ٹپک رہی تھی۔ اور وہ ایک بچے کی طرح تھی۔ جس کا عزیز ترین کھلونا اس سے پھینا جا رہا ہو۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا خفیت و نزار بیاہر پڑے پر قے کر رہا تھا۔ اور اس کا دم اُلٹ رہا تھا اور پیٹ فارم کا فرش غلیظ ہو گیا تھا اور بچے کی گردن ایک طرف جھک گئی تھی۔ اور وہ بھیل یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور اس نے تاری پی رکھی تھی۔

بچے نے پھرتے کی، اور وہ لڑکی زور زور سے چلانے لگی۔ اور بھیل اُسے پیٹنے لگا اور لڑکی نے ساگ کا گٹھا بھیل کے سر پر ڈے مارا۔ اور لوگ ہنسنے لگے اور پھر وہ بھیل خود بھی ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی۔ جیسے وہ آدمی نہیں تھا۔ پاگل تھا۔ ایسی بھی کیا ہنسی۔ مانا کہ آج جشن آزادی ہے۔ جشن فتح ہے۔ آج دنیا کو فاشیت کے چنگل سے نجات ملی ہے۔ اور ہندوستان کا ہر ہڈی مسرت کے نغمے گا رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یوں بے سوچے سمجھے تاری پی کر ہنسا جائے۔

چھوٹے بچے کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا اور وہ نیم برہنہ بھیلنی بیٹھی ہوئی اپنی پیٹی ہوئی دھوتی سے اس کی قے صاف کر رہی تھی۔ اور

بھوت

پولیس مین اسے اس طرح غلاطت پھیلائے پرگالیاں دے رہا تھا۔ اور اس کے پستان ننگے تھے۔ اُس کی باہیں ننگی تھیں۔ اور کاٹن مارکیٹ میں کروڑوں مین روٹی کے انبار لگے تھے اور اس کا پیٹ ننگا تھا۔ اور اس پر اک خوفناک ناگ کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ اور اس کی بانہوں پر بھی خوفناک دیوتاؤں کی سبز تصاویر کھدی تھیں۔ سٹاک ایکسچینج میں سونے چاند اور روٹی کا بھاؤ گر رہا تھا۔ لیکن وہ نیم برہنہ تھی۔ اور اُس کی ننگی باہوں میں لکڑی کے موٹے کرے تھے۔ سونے کے نہیں، چاندی کے نہیں پیتل یا تانبے کے بھی نہیں صرف لکڑی کے۔ اور ٹخنوں پر پاٹل کی تصویر کھدی تھی۔ کیونکہ جب عورت کو زیور نہ ملے تو وہ اُس کی تصویر دیکھ کر ہی کیوں نہ خوش ہو.....؟

اس کا لڑکا اس کی گود میں دم توڑ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ اور پولیس مین اسے گالیاں دے رہا تھا۔ اور اُس کا خاوند ناڑی کے نشے میں دھند اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ وہ ننگا تھا۔ اور اس کی بیوی ننگی تھی اور اُن کے آنسو ننگے تھے اور ان کی ہنسی ننگی تھی۔ کیونکہ بھیل سے اس کا جنگل چھن گیا تھا۔ اُس کا دیس چھن گیا تھا اُس کے تیر و کمان

بھوت

چھن گئے تھے۔ اب وہ اپنے گھر میں بے گھر تھا بے سہتیا رہتا تھا بے علم تھا۔ جنگل چھنا۔ لیکن شہر نہ ملا۔ جنگل کی چھال چھنی لیکن روٹی کا سوت نہ ملا۔ شکار چھنا۔ لیکن روٹی نہ ملی۔ تیر و کمان چھنے۔ لیکن بندوق نہ ملی۔ جڑی بوٹی چھنی لیکن دوا نہ ملی۔ وہ نہتا تھا۔ بے یار و مددگار تھا۔ اور مچھلیوں کا ٹوکرا لیے پلیٹ فارم پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔ اس نئی دنیا میں جہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

اس کا جھوٹا ہوا سر اور بھی جھونے لگا۔ اور ریل کے کھجے کا سہارا لے کر اپنے پیٹ پر جھک گیا۔ یکا یک اُس کی بیوی نے ایک چیخ کے ساتھ اپنے سر کو دو تہڑے پیٹ ڈالا۔ کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بار بار قے کرنے والا غلیظ لڑکا اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر اگئی تھیں۔ اور وہ بیوقوف عورت بار بار اپنے جوان پستان اس کے مردہ ہونٹوں میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لیے کہ اس کی ماما کے پاس اپنے دودھ بھھے پستانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوا کیا ہے۔ کھانا کسے کہتے ہیں مکھن اور دودھ، گلو کوس اور وٹامن اور کالرسے کو روکنے والے انجکشن اور ڈاکٹر لوگ یہ سب کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

ریشم کیا ہے۔ سینڈل کیا ہے۔ پتلا سایہ کیا ہے۔ آرام کیا ہے۔ کتاب کیا ہے۔
 علم کیا ہے۔ تہذیب کیا ہے۔ ہونٹ کیسے مسکراتے ہیں۔ آنکھیں کیسے جھپکتی ہیں۔
 سانس میں خوشبو کا تعطر کیسے پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ فتح
 کسے کہتے ہیں۔ فاشنزم اور ڈیموکریسی اور جنگ اور امن میں کیا تفریق ہے۔ اسے
 کچھ بھی تو معلوم نہ تھا۔ وہ یکایک اپنے مردہ بچے کو لے کر کھڑی ہو گئی۔ چمکتے ہوئے
 بالوں والی عورتوں سے جوئیں چھنے والے امیر و کبیر مار واطری سے
 سیٹی بجاتے اور اپنی پتلون کی نوک ہلک سنوارتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر
 سے اس کی حیران پھٹی پھٹی نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کے چمکدار
 بوٹ کی نوک سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور جب کہیں بھی انھیں اپنے سوال
 کا جواب نہ ملا تو اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں اور ہر اسال ہو کر زمین پر
 بیٹھ گئی۔ جیسے اس نے اس ذلیل مضافاتی اسٹیشن پر آدمیوں کا نہیں
 چٹانوں کا منہ دیکھا تھا۔

گاڑی اب دور سے نظر آنے لگی تھی۔ اور اس کا جو تاشاف آئینے کی
 طرح چمک رہا تھا اور اس نے صاف ستھرے چمکتے ہوئے جوتے کی
 نوک سے جھولتے ہوئے بھیل کو ایک ٹھوکا دیا۔ بھیل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

بھڑت

گاڑی آگئی۔ بھیل نے اپنے سر پر وہ مچھلیوں کا ٹوکرا رکھا، بغل میں مردہ
 بچے کو دبایا۔ ہاتھ سے سسکتی ہوئی بیوی کو پکڑا اور تھرڈ کے ایک ڈبے
 میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہوں میں وہی وحشت تھی۔ لبوں پر وہی ہنسی۔
 اور — وہ — فرسٹ کلاس کے نرم گدیوں پر بیٹھ کر بھی اک ہنرم
 سا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے بُزدل ذہن میں لاگھوں کو ڈروں ننگے،
 بھوکے پیاسے بیمار آدمی ابھر رہے تھے۔ گھستے چلے آ رہے تھے۔ اُس کے ذہن
 کے نرم نرم گدا گدالیوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔ اور اُس کی طرف دیکھ دیکھ
 کر ہنس رہے تھے۔ یہ ہنسی کیا ہے۔ یہ میسے گلے میں پھندا سا کیوں ہے۔ یہ
 کس کے ہاتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ پھیلے پھیلے، ٹیڑھے ٹیڑھے لمبے
 لمبے ہاتھ، سوکھے سکرٹے، سہمے سہمے ہاتھ، کمزور ہاتھ، قوی ہاتھ، وحشی ہاتھ
 بُزدل ہاتھ، دلیر ہاتھ، کالے ہاتھ، گولے ہاتھ، پیلے ہاتھ، کربچی بد نما ہاتھ، ہاتھ
 — جن پر زخموں کے نشان تھے۔ کوڑوں کے نشان تھے۔ ہل کی ہتھی
 کے نشان تھے۔ مشین چلانے کے نشان تھے۔ تیل کے نشان تھے۔ گولیوں
 کے نشان تھے — ہاتھ — جن پر انگلیاں نہ تھیں۔ شکستہ بوڑھے ہاتھ —
 جن پر نیلی دندیلیں ابھری ہوئی تھیں۔ کانپتے ہوئے ٹھنڈے، خوف سے لرزتے

بھوت

ہوئے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ جو ننگے تھے۔ اور خون آلود تھے اور ناسوروں سے بھرے ہوئے تھے اور اس پرہنس رہے تھے۔ اُن کی خاموشی میں ایک مہیب گویائی تھی۔ اُن کے تاریک سابلوں میں ایک عجیب گونج تھی۔ کسی خوفناک طوفان کی گونج..... اور یہ ہاتھ بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ آگے، اور آگے قریب اور قریب.....!

وہ چیخ مار کر صوفے پر سے اچھل پڑا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک انگریز سپاہی اپنی سانولی مجبور سے جس نے ریشمی نیلا سایہ پہن رکھا تھا اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ انگریز سپاہی حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے جانی؟ ڈر گئے تھے کیا؟“

”ہاں میں واقعی ڈر گیا تھا“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
”کس سے؟“

”ابھی ابھی میں نے اک بھوت دیکھا تھا“

”بھوت؟ اس گاڑی میں؟“ ساتھی نے پوچھا۔
”ہائنس!“

”نہیں سچ کہنا ہوں۔ بھوت تھا!“

بھڑت

”کس کا بھڑوت تھا؟“ اس نے اپنی محبوبہ کی ترشی ہوئی زلفوں سے
کھیلتے ہوئے پوچھا۔

”تیسری جنگِ عظیم کا بھڑوت“ اُس نے رکتے رکتے کہا۔
انگریز سپاہی اور اس کی سانولی محبوبہ کے چہرے فی تہو گئے۔ ڈبے
میں سٹاٹا چھا گیا۔ موت کا سا سکوت، جیسے اب وہاں کوئی نہ تھا اور
اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ڈبے کے کسی کونے میں کھڑا ہوا وہ بھیل ابھی تک
ہنس رہا ہے!

تین غنڈے

اس کا نام عبد الصمد تھا۔ وہ بھنڈی بازار میں رہتا تھا۔ محض اسی لیے بہت سے لوگ اُسے غنڈہ کہتے تھے۔ — ہوگا عبد الصمد بھی غنڈہ۔ گو اس بے چارے کو زندگی بھر یہ پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے۔ بالعموم لوگوں کو اپنی زندگی میں اپنے بارے میں تھوڑا بہت معلوم رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ انھیں اچھا سمجھتے ہیں۔ یا بُرا۔ وہ شریف ہیں یا بد معاش، عورتوں کو اپنی ماں بہن سمجھتے ہیں یا اپنی بیوی، وہ دیانت دار سمجھے جاتے ہیں یا جھوٹے۔ دروغ گو، فاسد یا امن پسند، انھیں کچھ نہ کچھ پتہ چلتا رہتا ہے اپنے متعلق۔ لیکن بیچارے عبد الصمد کو آج تک کمر میں گولی لگنے تک

تین غنڈے

پتہ نہ چلا کہ وہ ایک غنڈہ ہے، اسے گولی کیسے لگی یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عبدالصمد ایک غنڈہ تھا جو فائن آرٹ اینڈ پرنٹنگ ورکس میں کام کرتا تھا جو وزیر مستوراں کے قریب ایک سرخ اینٹوں والی دو منزلہ عمارت میں واقع ہے اور جس کے سامنے ٹرام کا اڈہ ہے اور جو آج کل جل کر کوئلہ ہو چکا ہے ہندوستانی اور انگریزوں کی دیرینہ رقابت کی وجہ سے، اس لڑائی میں ہندوستانیوں کی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوا ہی لیکن بے چارے انگریزوں کے کئی ہزار کارٹوس مفت میں پھنک گئے۔

عبدالصمد اسی فائن آرٹ پریس میں ملازم تھا۔ لٹھو کے بھاری پتھر اٹھا کے مشین پر جھاتا تھا۔ یہ اس کا کام تھا۔ دوسرے مزدور تو مشکل سے ایک پتھر ایک وقت میں اٹھا سکتے تھے لیکن عبدالصمد کے کام کرنے کا انداز یہ تھا۔ کوپان کی پیک زور سے سامنے نالی میں پھینک کر ایک موٹی سی گالی دے کے وہ بیک وقت دو پتھر اٹھا لیتا اور انھیں جان عزیز کی طرح سینے سے لگاتے ہوئے مینجر کی میز کے پاس سے گزر کر مسکرا کر ایک آنکھ میچ کر دل ہی دل میں مینجر کو ایک موٹی سی گالی دے کر وہ دونوں پتھر مشینوں

پر جانے کے لیے جاتا۔ اور ہنس کر مشین میں سے کتا، بوٹیا بھیکے ابلطفی
 جھاڑ مشین چلانے کو وہ فلفلی جھانا کتا تھا۔ دراصل اس کی اپنی زبان تھی جس میں
 وہ زندگی کے اہم موضوعات پر گفتگو کیا کرتا۔ جب مالک پریس میں آتا تو چپکے
 چپکے مزدوروں سے کتا۔ شیراز یا شیرا یاد دہانا۔ جب مالک نہ ہوتا اور منیجر
 سے چلانے لگتا۔ تو کتا کام کرو۔ کرو کام سُر کی اولاد۔ دیکھتے نہیں ہو
 گیدڑ کی بیوی رو رہی ہے۔ جب تنخواہ کا دن آتا تو کتا۔ آج بیچا لے
 کا چٹم بچتا ہو گیا۔ یہ چٹم بچتا کس زبان کا لفظ تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے
 کہاں سے سیکھا تھا۔ اس امر کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ عبدالصمد کی زبان تھی وہ اس
 کا مالک تھا اور اسے جس طرح چاہے استعمال کرتا۔ اسے کون روک سکتا
 تھا۔ زبان کے سلسلے میں اسے سب سے زیادہ عبور گالیوں پر تھا۔ میں
 نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا کہ جو عبدالصمد سے بہتر گالی دے سکتا
 ہو۔ تیری ماں کے دودھ میں حکم کا کیا۔ ایسی گالی کوئی شاعر ہی دے سکتا ہے
 اور گالیوں کے سلسلے میں عبدالصمد ایک شاعر تھا۔ حسن کا رہتا تھا۔ فصاحت و
 بلاغت کا بادشاہ تھا جب گالی دیتا تو اس کے انداز میں ایک ایسی خطا
 ہوتی اور زبان و بیان میں وہ روانی ہوتی کہ مجھے ہندوستان کے بہترین

تین غنڈے

سیاست دان یاد آجاتے جو اکثر باتیں زیادہ کہتے ہیں اور کام کم کرتے ہیں۔ لیکن عبدالصمد میں یہ ایک خاص بات تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا تھا تو کام بھی بہت اچھا کرتا تھا۔ پریس کے مینیجر کو وہ اپنی بدزبانی کی وجہ سے ناپسند تھا۔ لیکن کام اتنا اچھا کرتا تھا کہ وہ اسے پریس سے نکالنا نہ چاہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے اور ممکن ہے آپ نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ کہ جتنے غنڈے ہوتے ہیں۔ کام کرنے میں اپنا جواب نہیں لکھتے۔ سب سے اچھے مزدور بھی غنڈے ہوتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے۔

ہے نا!

عبدالصمد ایک اچھا مزدور تھا۔ اور اگر اس میں بات بنانے۔ گالی بکنے اور بلاوجہ لوگوں پر ہنسنے کی عادت نہ ہوتی تو وہ ایک اچھا آدمی بھی ہوتا۔ ہاں وہ ہر وقت پان کھاتا تھا۔ جس سے اس کے بڑے بڑے دانت اور بھی کریمہ معلوم ہوتے تھے۔ گالی بکنے میں اسے وہ کمال چل تھا۔ کہ بڑے بڑے ادیبوں کو عمر بھر کی محنت کے بعد بھی وہ طرز انشاء نصیب نہیں ہو سکتا اور ہنسی، اس کی ہنسی سب بڑی تھی۔ پاٹ دار، گونجدار بلند و بالا ہنسی جو پریس کی تاریک عمارت اور خاص کر جس کمرے میں وہ

تین غنڈے

کام کرنا تھا۔ اس کے لیے قطعی طور پر ناموزوں تھی۔ یہ ہنسی یاد دلاتی تھی۔ پہاڑوں کی جہاں صنوبروں کے جنگل کھڑے ہیں۔ وسیع میدانوں کی جہاں میلوں تک گیسوں کے کھیت کھڑے ہیں، تاروں بھری رات کی جب سب سو جاتے ہیں اور رات کی رانی اس افق سے اُس افق تک زلفیں پھیلائے سورج کی کرنوں کا انتظار کرتی ہے۔ یہ ہنسی جو گریا سمندر کا سینہ چیر کے نکلی تھی اور ساری دھرتی پر پھیلی جا رہی تھی۔ انسان کی ہنسی نہیں کسی بوج کی ہنسی معلوم ہوتی تھی۔ کرخت، بُری، گندی، ابھری ہوئی، بڑھتی ہوئی یہ پریس کی محدود تاریک چار دیواری کے لیے قطعی ناموزوں تھی۔ اس پر بھی عبد الصمد اکثر ہنسا رہتا تھا۔ گالی بکتا رہتا تھا۔ اور منجر کے سامنے لیتھو کے پتھر اٹھائے اکڑتا چلا جاتا تھا۔ غنڈا!

میں نے پہلی بار اسے فائن آرٹ پریس میں دیکھا تو ایک سخت کراہت اور نفرت کا احساس میرے دل میں پیدا ہوا۔ جے جے ہسپتال کے رشتہ کے لوگ اک "محفلِ رقص و سرود" منعقد کرنا چاہتے تھے۔ اور میں اس کنسرٹ کا پروگرام شائع کرانے کے لیے پریس میں آیا تھا۔ یہاں میں نے عبد الصمد کو پہلی بار دیکھا۔ آپ بڑے ٹھٹھے سے مکر پرکات لکھے فرما رہے

تین غنڈے

تھے۔ ”وہ لیتھو کا پتھر مجھ سے ٹوٹ گیا۔ مینجر صاحب“
”کیسے ٹوٹ گیا۔“

”یہ کیسے بتاؤں بس بات سے چھوٹ گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا۔ دیکھئے
اس مادہ چود پتھر کو آج ہی ٹوٹنا تھا۔ دو سال ہو گئے مجھے اس حرامی پریس
میں کام کرتے ہوئے۔ دیکھئے کبھی ایسی واردات نہیں ہوئی۔“ یہ کہہ کر
آپ نے سر کھجایا اور سر سے ایک جوں نکال کر اُسے اپنے ناخنوں کی چکی
میں پیتے ہوئے لٹوئے۔ ”بہت تیزی جوں کے منہ میں سُر کے کباب!“
مینجر بولا۔ ”سیدھی طرح بات کرو۔“

”سیدھی طرح تو کہہ رہا ہوں۔ جناب منیجر صاحب۔ لیتھو کا پتھر ہم سے
ٹوٹ گیا۔ معافی چاہیے۔“ یہ کہہ کر منہ لگا۔ گویا معافی مانگنا اُسے عجیب
سا لگ رہا تھا۔ اس کے دانت اور اس کے مسوڑھے بلکہ اس کا حلق
اور نالونک مجھے نظر آ رہا تھا میں ذرا پرے ہٹ گیا۔ کیونکہ اس کے
جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی تھی۔ ہر غنڈے کے جسم سے بو آتی ہے
زمین کی بو، پسینے کی بو اور پیاز کی بو۔ اور گو اس کا جسم بدبو دار تھا۔ اس کا
دل بدبو دار نہیں تھا۔ جس طرح اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ شریر آنکھیں گھنے

ابروؤں کے نیچے چمکتی تھیں۔ اس میں کوئی بدبو نہ تھی۔ دس تا ستر گرجا
اُسے تنخواہ ملتی اور وہ منیجر صاحب کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتا
ایسی نگاہیں جن میں تشکر کے علاوہ حیرت ہوتی اور ایک ایسا جذبہ جیسے
وہ نگاہ کہہ رہی ہے۔ تو منیجر نہیں ہے تو میرا بھائی ہے۔ ہم دونوں انسان
ہیں۔ اس جذبے میں بھی کوئی بدبو نہ تھی اور اس کی مسکراہٹ، غلیظ
مسکراہٹ جس میں پریس کاپینٹ اور مشینوں کا آئیل گھلا ہوا تھا اس
میں بھی کوئی بدبو نہ تھی۔ لیکن اس کا جسم بدبو دار تھا۔ اس کے مسوڑھے غلیظ تھے۔
اس کی باہروں کے مسل چھوٹے ہوئے تھے۔ اور وہ گالی بکتا تھا۔ اور ہر وقت
لڑائی کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ وہ غنڈا تھا۔ غنڈا۔ اور جب منیجر نے اسے
اس طرح ہنستے ہوئے معافی مانگتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی ایک غیر آدمی
کے سامنے، تو اس کے دل میں غلیظ و غضب کا اک طوفان اٹھ اٹھا اور اس
نے بات میں لکڑی کا رول لے کر میز پر زور سے مارا اور عبدالصمد کو
بلند آواز میں گالی دے کے کہا: کہ وہ کبھی اس کا قصور معاف نہیں کرے گا
لیتھو کا پتھر بہت منگاہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے۔ بوریہ سے آتا
ہے جو جرمنی میں واقع ہے تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اور آج کل ٹبری مشکل سے

تین غنڈے

دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ جرمنی کو اتحادیوں نے شکست دے دی ہے
تمہیں معلوم نہیں ہے آج کل پتھر بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔

عبدالصمد نے جواب دیا ”مجھے سب معلوم ہے۔ پتھر تو ہندوستان
میں ہی آتے ہیں کہ ایک پوری فوج پتھر مار مار کے ہندوستان سے باہر
نکالی جاسکتی ہے۔ پتھر تو ملتا ہے مینجر صاحب لیکن روٹی نہیں ملتی۔ گالی
کے بغیر بے عزتی کے بغیر جرمنی جر صاحب اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ گالی دینے
میں آپ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ کہہ کر عبدالصمد نے جو مینجر کی ماں
کے دودھ میں حکم کا ایک پھیرنا شروع کیا تو سارے پریس ہالے اس کے گرد
جمع ہو گئے۔ مینجر نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی۔ عبدالصمد نے
کہا ”گھر رکھو اپنے پتھر۔ عبدالصمد عبدالصمد ہے۔ اس کا چٹم بشتا نہیں
ہو سکتا۔ پتھر ٹوٹ گیا تو ہم کیا کریں۔ اپنے چٹم چوڑا کاٹ کے رکھ دیں
پریس میں، واہ مینجر صاحب اور اوپر سے گالی دیتے ہو۔ ہم کام نہیں
کریں گے کبھی کام نہیں کریں گے۔ اس سارے پریس میں۔ ہم ابھی چلے
جاتے ہیں۔ فوراً اسی وقت چلے جاتے ہیں۔“ عبدالصمد دیر تک اسی
طرح بکتا جھکتا رہا لیکن پریس چھوڑ کے گیا نہیں۔ اس معاملے میں اس کی

تین غنڈے

سیاست انگریزوں سے ملتی جلتی ہے جو ہمیشہ ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں لیکن کمبخت جلتے نہیں بخیر وہ خود نہیں گیا، تو دوسرے روز منجنبر نے پریس کے مالک سے کہہ سُن کے عبدالصمد کو وہاں سے نکلوا دیا۔ یہ فسادے دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے اگلے روز عبدالصمد کو دیکھا کہ سڑکوں پر اور بھنڈی بازار کے مختلف راستوں پر اور دوسرے غنڈوں کے ساتھ مل کر شور و داد مچا رہا تھا اور ہڑتال کر رہا تھا ایک جگہ سٹرچر ریگر جو مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں تقریر کر رہے تھے۔ ہمیں اس ہڑتال میں، اس فساد میں، اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ یہ سب کانگریس کی شرارت ہے۔ تو اس وقت بھی عبدالصمد اور اس کے ساتھی غنڈوں نے شور مچا کر اس امن پسند لیڈر کی ایک نہ چلنے دی اور ”جے ہند“ اور ”ہندوستانی جہازی ہڑتال زندہ باد“ کے نعے لگاتے گئے اسے جلسے سے باہر کر دیا اور پھر میں نے سنا کہ ان لوگوں نے ہڑتال مانی اور ٹرامیں اور ٹرام کے ٹیڈ جلا دیے اور ان تمام کاموں میں عبدالصمد بھی شامل تھا لیکن ان باتوں کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ چند ریگر کی میٹنگ کے بعد میں نے عبدالصمد کو جے ہسپتال میں دیکھا۔ گولی اس کی پیٹھ میں کمرے کے پاس لگی

تین غنڈے

تھی اور پیٹ پھاڑ کے باہر ہو گئی تھی۔ مگر کبے باس ایک چھوٹا سا سولن تھا۔ جہاں گولی اندر داخل ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف پیٹ میں ایک بہت بڑا زخم تھا جو ہزاروں چھروں سے پیدا ہوا تھا۔ یہ کارٹوس ڈم ڈم والی گولی والا کارٹوس نہ تھا جو گذشتہ غدر میں استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ایک نیا کارٹوس تھا۔ نیا اور فٹاک جو جسم کے اندر جا کے پھیل جاتا ہے۔ اور سینکڑوں چھوٹے چھوٹے زخم پیدا کر سکتا ہے۔ مارنے کو تو انسان کو یوں بھی ایک معمولی سے کارٹوس سے مارا جاسکتا ہے۔ لیکن غنڈوں کے لیے اس قسم کا کارٹوس ذرا اچھا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ کارٹوس سور کے شکار کے لیے استعمال ہوتے ہیں خیر غنڈے تو سور سے بدتر ہوتے ہیں۔ اچھا ہوا عبد الصمد مر گیا۔

عبد الصمد مر گیا اور اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ عمر چوبیس سال۔ ذات راجپوت۔ مذہب مسلمان۔ غیر شادی شدہ آنکھوں کی جھپک مردہ، لبوں کی ہنسی مردہ۔ زندگی بخش گالی مردہ۔ ہر چیز کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور وہ میرے سامنے ہات پھیلائے، منہ کھولے۔ مردہ پڑا تھا۔ ایک طعنہ، ایک تار ایک مستقبل۔ ایک خاموش گالی۔ اور اس کی ماں اپنی چھاتی دوتہڑ ٹکڑ رہی تھی اور میں کر رہی تھی اور ہسپتال کے باہر خیمے میں

تین غنڈے

بیٹھے ہوئے سپاہیوں کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ میرے بیٹے نے ان ظالموں کا کیا بگاڑ اٹھا۔ میرا بیٹا کیوں مر گیا۔ کیوں گولی اسے لگی۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑ اٹھا۔ وہ تو گولی میں بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی اینگلو انڈین لڑکی کو بچانے کے لیے باہر نکلا تھا اور کسی نے اس کی پیٹھ میں گولی مار دی لڑکی بچ گئی۔ لیکن میرا جوان — ہونہار بیٹا۔ ڈاکٹر! میرا بیٹا اس جہان میں نہیں ہے، وہ کیوں مارا گیا ڈاکٹر خدا کے لیے مجھے بتاؤ وہ کیوں مارا گیا۔ اس لیے کہ وہ ایک غنڈہ تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا اور اس کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا اور دوسری لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوسرے غنڈے سے میری ملاقات ایک بنٹے کے گھر پر ہوئی۔ سینڈھرسٹ روڈ جسے گنڈا اس روڈ کہتے ہیں۔ بڑے بڑے بنیوں کا مسکن ہے۔ یہیں پدم سی سیٹھ بھی رہتے ہیں، پدم سی سیٹھ جے جے ہسپتال کے ڈاکٹروں میں بہت مقبول ہیں۔ کیونکہ آپ سو پلے پر ایک سو بیس پلے سود لیتے ہیں۔ اور سارا معاملہ نہایت خاموشی سے طے کرتے ہیں۔ پدم سی سیٹھ کا پہرہ بچوں کی طرح بھولا نظر آتا ہے۔ مسکراہٹ لکھی میں چٹری چڑی

تین غنڈے

معلوم ہوتی ہے۔ اور لب دلہن میں راشن کے باوجود اتنی شکرگھلی ہوئی ہے کہ چور بازار کا شبہ ہوتا ہے۔ پدم سی سیٹھ میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ مجھے قرض کی اکثر حاجت رہتی ہے۔ اور جو دوست مجھے روپیہ ترض نہ دے میں ذرا اسے دوست کم بناتا ہوں اور اور پھر پدم سی سیٹھ کوئی زیادہ سود نہیں لگاتے۔ سو روپے پر صرف ایک سو بیس روپے۔ اور پھر وہ بھی بغیر ضمانت کے۔ اب بتائیے اس سے اچھا سودا ہندوستان سے باہر کہاں ہو سکتا ہے۔ آج بھی جب میں غنڈوں سے بچتا بچتا سینڈھرسٹ روڈ پر پدم سی سیٹھ کے مکان پر پہنچا تو انھوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ وہ مجھے کبھی نہیں ٹالتے ہمیشہ روپیہ دے دیتے ہیں۔ یہ تو انھیں معلوم ہے کہ میں جسے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں۔ اور مجھے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے اور روپیہ مع سوا دا بھی کر دوں گا۔ انھیں میرے عشق کا پورا حال معلوم ہے۔ وہ اس نرس کو بھی جانتے ہیں۔ جو اس قدر خوبصورت اور مہنگی ہے کہ اس کے لیے ایک کنڈرائے نوجوان ڈاکٹر کو ایک سو بیس روپے سیکرہ سود دینا پڑتا ہے ہندوستان میں ایک تو عشق بہت مہنگا ہے اور پھر خلافِ قانون

تین غنڈے

بھی ہے۔ سماج نے اور سیاست اور حکومت نے محبت کو خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے۔ آپ کسی انسان کو قتل کر سکتے ہیں مگر اس سے عشق نہیں کر سکتے اگر آپ کسی لڑکی سے کہنا چاہیں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تو وہ فوراً جواب دیتی ہے۔ کیوں کیا تیرے گھر ماں بہن نہیں ہے۔ گویا اس ملک میں عشق صرف ماں بہن تک محدود ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آدمی عشق کرنے کی جرأت کرے تو جوتی کھاتا ہے۔ پٹا ہے یا گولی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان محبت کرنے کی نہیں نفرت کرنے کی جگہ ہے۔ یہاں انسان انسان سے محبت نہیں کرتا ہے۔ نفرت کرتا ہے۔ لوگ حکومت سے، حکومت لوگوں سے ماں باپ بیٹوں سے۔ بیٹے ماں باپ سے نفرت کرتے ہیں، گھر میں بازار میں، کارخانوں میں، دفتروں میں نفرت کا راج ہے۔ کانگریسی، لیگی، سوشلسٹ ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ انہیں جتنی نفرت ایک دوسرے سے ہے اتنی اجنبی حکومت سے نہیں جس کے یہ سب غلام ہیں، ہندوستان ایک صحرائے نفرت ہے۔ جس میں کہیں کہیں محبت کے نخلستان نظر آتے ہیں۔ اور یہ نخلستان، نرسوں، دیہاتی لڑکیوں اور فلم ستاروں اور عدم تشدد کے حامیوں نے اُگاٹے ہیں۔

یتیم غنڈے

چاروں طرف نفرت کی ریت ہے۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔ شاید اس ملک کی آب و ہوا یہی ہے۔ بیچالے پدم سی سیٹھ بھی اسی آب و ہوا میں رہتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک آدمی سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر اس نفرت میں کوئی شامل نہیں ہے تو وہ ان کی چھوٹی بیٹی — شانتا ہے۔ شانتا ایک پتلی دہلی ۹ سال کی گجراتی لڑکی ہے جس کو خدا نے نہ خوبصورتی دی ہے نہ وٹامن، پتلی پتلی ٹانگیں، میدے فراک سے باہر نکلتی ہوئی پتلی پتلی باہیں، سوکھا سوکھا سامنہ جیسے پیاس کبھی کبھی ہی نہیں، ہر وقت چلاتی رہتی ہے اور نہ میں مٹھائی ٹھونس رہتی ہے۔ اس قدر پھوہڑ، بد مذاق، بد صورت لڑکی ہے کہ معاذ اللہ دیکھ کے متلی ہوتی ہے۔ مجھے تو ایک تو بچوں سے یونہی نفرت ہے۔ کبکحت جب دیکھو یوں ہی بلا سوچے سمجھے چلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کرسی پکڑ کر ملا رہے ہیں۔ تو کبھی آپ کا کوٹ کھینچ رہے ہیں، کبھی تھرمامیٹر پر ہاتھ مارتے ہیں تو کبھی دیوار پھاندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی سچی جیسے ایک پل قرار نہ ہو۔ جس کی آواز بھی تیز اور کرخت ہو۔ اور جس کے لبوں سے ہر وقت جلیبی کی رال بہتی ہو۔ اور جس کا باپ مجھ سے ایک سو بیس روپے سو لیتا ہو، آپ اس لڑکی سے میری محبت اور شفقت کا اندازہ کر سکتے ہیں خیر تو

تین خنڈے

اس روز جب میں وہاں پہنچا ہوں تو شانا کمرے میں موجود تھی اور ادھر سے اُدھر اور اس کمرے سے اس کمرے میں اچھل رہی تھی اور چلا رہی تھی اُھلیلیاں کھا رہی تھی پدم سی سیٹھ نے اسے ڈانٹا اور کہا ”دوسرے کمرے میں بیٹھ جا۔ دیکھتی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں“ تو شانا بسورتی ہوئی اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دیتی ہوئی اور شکایتیں نکالتی ہوئی سے مجھے گھبراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ باپ نے اسے جاتے دیکھ کر پھر کہا ”اور ماں دیکھ باہر نہ جانا بیٹا باہر نہ نکلا ہے۔“ پھر انھوں نے بھی کھولی اور شرم کی طرح ملائم آواز میں بولے ”آپ کو کتنے روپے چاہئیں ڈاکٹر صاحب“ میں نے کہا ”آج تو میں اپنی آخری قسط ادا کرنے آیا ہوں۔ فی الحال مجھے روپے نہیں چاہئیں۔ کیونکہ نرس سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔ اس لیے میرا عیش ختم سمجھئے۔“ وہ ہنسے ”تو رسید کاٹ دوں“ میں نے کہا ”ہاں لائیے میں بھی دستخط کیے دیتا ہوں“ چنانچہ رسید کاٹ دی گئی اور دستخط ہو گئے اور اٹشام واپس مل گیا اور پھر میں سگر سیٹ اور وہ بٹری پینے لگے اور ہونے لگیں جہاں بھر کی باتیں۔ روٹی کا بھاد مندا ہے اور سونے چاندی کا دھندا ہے اور شاک اسچینج گندا ہے اور گلے میں انگریزوں کا پھندا ہے۔ اور

تین غنڈے

”ہم تو ڈاکٹر صاحب رام آپ کا بھلا کرے بہت بری طرح پھنسے ہیں۔
یہ سٹرنگ بیلنس میں لے کہا۔ جی ہاں یہ سٹرنگ بیلنس ہی تک معاملہ
رہتا تو غنیمت تھا۔ لیکن سیٹھ صاحب سٹرنگ بیلنس کی انہوں نے
ایک اور شق نکالی ہے اسے carotia Artery کہتے ہیں۔“
”کیئرلڈ آرٹری کیا ہے؟“

”کیئرلڈ آرٹری کے ساتھ اینٹی ٹی بی ہائی پوکا کائی جرمنی سائیدل لگا کے
ساتھ میں اس کو Anti Septic بھی کر دیا ہے۔ سیٹھ صاحب
”باپ لے“ سیٹھ صاحب چونکے۔ ”تب تو معاملہ بہت ٹیرھا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”جی ہاں انگریزی اخبار میں سب آیا ہے، آپ نے
پڑھا نہیں۔“

سیٹھ صاحب بولے۔ ”جی نہیں میں تو جنم بھومی پڑھتا ہوں۔ یہ تو اچھا
ہوا آپ نے بتا دیا۔ ایک تو یہ فساد شروع ہے جہازیوں نے ہر تال کر لکھی
ہے۔ غنڈہ گردی ہو رہی ہے اور ادھر سے یہ اینٹی سپٹک آپ نے
بتا دیا میں تو صاحب چور بازار میں جتنا روپیہ لگا رکھا ہے اب نکلواتا ہوں۔“
اتنا کہہ کے سیٹھ صاحب نے کروٹ بدلی۔ تو نیچے گلی میں کارٹوس

تین غنڈے

دغنے کی بار بار آواز آئی۔ بولے دیکھا اپنے ہڑتال کرنے سے یہ ہوتا ہے۔
یہ غنڈے بد معاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا
ہے۔ یہ غنڈے بد معاش امیر لوگوں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ کارخانے جلانا
چاہتے ہیں شہر کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی کلجگ آگیا ہے۔ کلجگ
دھرم کا بیج نہیں۔ اس دھرتی پر۔

میں نے کہا: آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔“

اتنے میں پھر گولی چلنے کی آواز آئی اور گلی میں آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی
اونچوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم بھاگے بھاگے کھڑکی کی طرف گئے اور
نیچے جھانک کر دیکھا تو یکایک سیٹھ نے چیخ ماری اور پھر دھڑا دھڑ
سیریاں نیچے اترنے لگے۔ میں ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ کوئی خاص بات
نہ ہوئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ گلی کے بچے پولس والوں سے آنکھ مچولی کھیلے تھے
یہ لوگ چھپ کے گلی کے دوسرے کونے میں چلے جاتے اور وہاں سے
پولس والوں پر ”جے ہند“ کے نعرے کہتے اور ان پر کنکر پتھر کے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے پھینکتے اور جب وہ پولس والے ان کو ڈراتے اور ان
کا تعاقب کرتے تو بچے بھاگ کے ہنستے کھیلے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے

تین غنڈے

گلی کے دوسرے نکر پر جا کھڑے ہوتے اور وہاں بھی اسی طرح پولس والوں سے کھیل کھیلتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اور یہ بچے دن بھر اسی طرح مشغول رہتے تھے کوئی دوسرا ملک ہوتا تو ان بچوں کی یہ شرارت کھیل سے تعبیر کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پولس کا سپاہی کسی شریک کے کان کھینچ دیتا۔ دیکھ بیٹا انڈہ سے ایسا مت کیجو اور معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔ لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے اس ملک میں محبت نہیں نفرت کا راج ہے۔ اس لیے پولس والوں نے ملٹری کو مدد کے لیے بلا لیا۔ اور سینڈھرسٹ روڈ پر آنکھ مچولی کا وہ دلچسپ کھیل شروع ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ بچے جب حسب معمول چنچتے چلتے۔ کنکر پھینکتے گلی کے نکر پر پہنچے تو یہاں گولیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اور پھر وہ جب یہاں سے ہٹ کے دوسرے نکر پر پہنچے تو وہاں بھی گولیوں سے ان کی آؤ جھکت کی گئی۔ نسکر کی گولیوں سے نہیں۔ کارٹوس کی گولیوں سے۔ جب بچے زخمی اور جاں بلب ہو کے وہاں سے بھاگے اور گلی کے تیسرے ناکے کی طرف چلے تو وہاں بھی آنکھ مچولی کھیلنے والے سپاہی بیٹھے تھے۔ دھڑا دھڑ گولیاں چلیں اور پھر اس کے بعد کلینکٹ سنا ہوا گیا۔ چاروں طرف خاموشی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اب جے ہند کہنے والا کوئی نہ تھا۔ سپاہی چلے گئے۔ پھر

تین غنڈے

یہ ایک لڑکے کی گلی میں گھس آئے اور اپنے زخمی اور مردہ بچوں کو اٹھانے لگے اور مائیں اور بہنیں بھائی اور باپ دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ پیم سی سیٹھ نے اپنی زخمی شانتا کو اٹھا لیا اور ہم دونوں مل کے اُسے اوپر کمرے میں لے آئے۔ پیم سی دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ شانتا میں نے تجھ سے کہا تھا باہر نہ جانا، باہر نہ جانا، کبھی نہ جانا۔ وہ طوطے کی طرح رٹ رہا تھا اور ہاتھ ملتا جا رہا تھا اور وہ بد صورت گجراتی کچی جے ہند کہتے ہوئے مر رہی تھی اور اس کے منہ سے لہو ابل رہا تھا۔ اس کے منہ سے اس کی بانہوں سے اس کے سینے سے لہو نکل رہا تھا۔ اس کا جسم اپنے لہو کے رنگ میں رنگا گیا۔ سرخ رنگ۔ لال اور صحنی۔ ماتھے کا سیندور، وہ نو سال کی کچی آج بیاہی جا رہی تھی۔ ننھی معصوم دلہن، اس رنگ لے گویا اس کی بد صورتی غائب کر دی۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا اس کی باہیں گول اور گداز اور چھاتی ماں کے دودھ سے بھاری، اے بن بیاہی دلہن آج تیری مانگ میں شہیدوں کا لہو ہے۔ تیری بڑی بڑی آنکھوں میں اُجڑے وطن کا سماگ ہے۔ تیرے ترے ہوئے لبوں پر جے ہند کا نغمہ ہے۔ آج تو نے ملک کو اپنی زندگی کی آخری قسط ادا کر دی اور اپنے خون سے رسید لکھ کر دے دی ہے۔ اے ننھی غنڈہ لڑکی

تیری موت آج ہم سب پر بھاری ہے اور میں نہیں جانتا کہ کیا کروں کس طرف دیکھوں۔ کس کو بلاؤں۔ کس کو یاد کروں کیوں کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے اور تیرے وطن کے بڑے آدمیوں نے تجھ سے غداری کی ہے اور تیرا المو انتقام کے لیے پکار رہا ہے۔

گجراتی لڑکی مرگئی۔ ایک دوسکیاں بے ہند کا دم ہوتا ہوا نغمہ، اور پھر اس کا خون پگھلے ہوئے یا قوت کی طرح فرش پر بکھر گیا۔ مجھے فضا کی خاموشی یاد ہے۔ جیسے ساری کائنات رو رہی ہو۔ مجھے وہ نگاہ یاد ہے۔ جیسے ہزاروں برجھیاں ایک ساتھ دل میں کبھی جا رہی ہوں۔ گجراتی لڑکی مر گئی اور اس کے ساتھ اس کا ہونے والا شوہر مر گیا اور اس کے خولصورت بچے مر گئے۔ اور زندگی اور اس کی تخلیق اور اس کی ساری کی ساری خوبصورتی مر گئی۔

کیا ہونا چاہیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ نغمہ اور وہ پکارا اور وہ آہنگ جس میں اس بچی کا خون گھلا ہوا کبھی مر نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب کوئی گیت، کوئی چیخ، کوئی تہنہ کسی کے خون سے لہج جائے تو پھر وہ کبھی نہیں مرنے والا ہے۔ وہ گلے میں بھندابن

تین غنڈے

کے رہتا ہے۔ دل میں ناسور بن کے چھپتا ہے اور دُروح میں کانٹا بن کر کھٹکتا ہے اُسے غنڈہ کہنا آسان ہے، اُسے بھول جانا ممکن نہیں ہے۔

۳

تیسرا غنڈہ جو مجھے ملا، وہ سکھ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں نہیں اپنی موت کے بعد مجھ سے ملا۔ اس نے ایک شلوار پہن رکھی تھی اور ایک پتلی دھاریدا قمیص اور اس کے چہرے پر گولی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ اس کا گندمی چہرہ خاموش تھا۔ خاموش اور نظرباب اور اس کی خچوٹی بھوری وارٹھی میں ریشم کی ملائمت تھی۔ اس کے خدخال حسین تھے اور زمین کی طمانیت لیے ہوئے اس کے چہرے سے مجھے جاٹوں کے وہ گاؤں یاد آ گئے جس میں دھرتی سونا اگلتی ہے۔ جہاں سونے کی مورتیں اپنی سیاہ غزالی آنکھوں میں وحشی محبت کا خمار لیے ہوئے ننگھٹ پر کھڑے ہو کر پڑیسوں کو پانی پلاتی ہیں۔ جہاں نہر کے کنارے لابی لابی دریا ئی گھاس ہوتی ہے۔ اور نہر کے پے گہیوں کے خوشے سرسرا تے ہیں اور خوشوں سے اوپر نیلا آسمان ہنستا ہوا آسمان اور اوپر اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک بھولا ہوا خواب ایک پراسرار حقیقت، اچانک مسرت، یہ سب کچھ اس نوجوان سکھ کے چہرے

تین غنڈے

پرنظر آ رہا تھا۔ اس کی قمیص کی جیب میں ایک نامکمل خط تھا۔ یہ خط اس نے شاید صبح لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر وہ اسے مکمل نہ کر سکا کیونکہ صبح ہو گئی اور پھر اس کی زندگی کی شام آ گئی۔ اور اس کی آنکھوں کی بینائی اور اس کے ہونٹوں کی گویائی اور اس کے ہاتھوں کی طاقت اس سے چھن گئی۔ گنڈہ مر گیا۔ اس کا مجھے افسوس نہ تھا۔ افسوس اس خط کے نامکمل ہونے کا ہے یہ خط گورکھی میں تھا اس کا ترجمہ تو میں نہیں کر سکتا۔ کوئی کسی کی روح کا ترجمہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس لہجے کا۔ اس زبان کا۔ اس طرزِ ادا کا۔ جو شخصیت ہے۔ پھر بھی جیسا بُرا بھلا مجھ سے ہو سکا۔ یہاں درج کرتا ہوں۔

”میری ماں جی۔ ست سری اکال۔ واہگورو کی کرپا سے میں یہاں خیریت سے ہوں اور خیریت آپ کی واہگورو مہاراج کی کرپا سے لکھنا مجھ کو بہت جلدی، اپنے کو ابھی کوئی ٹھکانا نہیں ملا ہے اور کوئی کام کاج بھی ہے نہیں۔ شہر بمبئی کے بیچ میں ڈنگا ہے اور ہندو مسلمان ایک ہے واہگورو کی کرپا سے فکر نہ کرنا۔ تیرا بیٹا جورو کو کرمی حلال کرے گا۔ تجھ کو روپے بھیجے گا۔ اپنی اچھری بہن کی شادی کرے گا۔ اور اس باپ چوڑو کے بچے بننے کا سود بھی دے گا۔ میری ماں جی بدکلامی پر ہم کو ماپھ کرنا۔“

کھال چند بنے کا نام لیتے ہی تیرے بیٹے کو گتہ اُجماتا ہے۔ ادھر ابھی میں کربال سنگھ ڈرائیور کی لاری میں سوتا ہوں اور روز صبح اس کی لاری ٹھوتا ہوں۔ جگجیت سنگھ کو بولنا کہ وہ بہن بنتو کا بیاہ اس بھین یاوے منو ہر سنگھ سے نہ کرے نہیں تو اس کی جان مار دوں گا۔ جب مجھ کو نوکری ملتی ہے تو ایک دم آگے خود بنتو کو بھگا کے لے جاؤں گا۔ میری ماں جی وہ تمھاری ہو۔ اچھی بہن کے خدمت کرے گی۔ اور۔۔۔۔۔“

اس سے آگے خط کچھ نہیں کہتا۔ ماں جو لوگ اس سکھ نوجوان کی لاش کو ہسپتال میں لائے تھے وہ کہتے تھے کہ اس نوجوان نے ہمیری کیڈ پر اپنی جان دی ہے۔ وہ گرانٹ روڈ والے جلوس کے آگے آگے پگڑی سنبھا جٹا والا گیت گارہا تھا اور بے فکری سے آگے بڑھ رہا تھا اور جب اسے گولی لگی جب بھی گیت گارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانگرس اور لیگٹ نوں جماعتوں کے جھنڈے تھے۔ دائیں بائیں انھیں لہراتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور وہ اس خون کی بارش میں بڑھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ اور جب وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گر گیا تو اس نے کہا یہ میری قمیص اور شلوار کسی حاجت مند کو دے دینا اور مجھے

تین غنڈے

بیکھ دھرم افسار جلا دینا۔ اتنا کہہ کے اس نے جان دے دی۔ اور وہ وہیں ٹرام لائن پر مر گیا۔ اور دونوں جھنڈے اس کے خون سے سُرخ ہو گئے۔ لیگ کاسبز جھنڈا اور کانگرس کاسبز سفید زعفرانی جھنڈا دونوں اس کے خون سے ایسے سُرخ ہو گئے تھے کہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کون جھنڈا کس کا ہے اور وہ جو نہ ہندو تھا نہ مسلمان اس نے اپنا لہو دے کر دونوں جھنڈوں کو ایک کر دیا تھا۔ وہ جو ایک کسان تھا۔ اجداد اور ان پڑھ تھا۔ غنڈہ!

میں نے اس کی شلوار اور قمیض اپنے ہسپتال کے ہر بچن دھوبی کو دے دی۔ دھوبی نے وہ شلوار پہن رکھی ہے۔ نیلی قمیص اس کی بیوی پہنتا چاہتی ہے۔ اس نے اسے پھر سیاہ ہے۔ جوڑا ہے۔ دوسرے کپڑے کے ٹکڑے لگائے ہیں اور اب یہ قمیص دھوبی کے گھر کے باہر جنگلے کی سلاخ پر پڑی جھول رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ عجیب قمیص ہے جو پنجاب آئی ہے جسے کسی کسان بچے کی ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سیاہ ہے، شاعر اور لوگ بڑے بڑے لوگوں کو بڑے بڑے لیڈروں کو سلام کرتے ہیں۔ میں تجھے سلام کہتا ہوں۔ اے غریب مفلوک الحال قمیص، بھولی ہوئی

تین غنڈے

بسری ہوئی گالیاں کھاتی ہوئی قمیص، میں تجھے ہزار بار سلام کہتا ہوں۔ تو نے اک بھولے جاٹ کے مضبوط سینے پر گولی کھاٹی ہے۔ تو نے اس سے پیار کیا ہے۔ اس کا ساتھ دیا ہے، زندگی میں اور موت میں اور اس وقت جب اس ملک کے بڑے بڑے چاہنے والے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے تجھ پر ہزاروں سلام۔ اے میرے وطن کی وسیع غریبی کی طرح بھیڑ پرانی قمیص، تو نے اپنی آغوش میں ایک معصوم کاشتکار کے دل کی دھڑکنیں چھپائی ہیں اور اب تو ایک ہتکچہ مال کے دودھ کی عزت اور اس کے ننھے بیٹے کی جان کی حفاظت کرے گی۔ انھیں بھی اپنی زندگی کی سادہ روئی بخش۔ انھیں بھی اپنی دھرتی کا پیار دے، اپنی روح کا وہ صادق جذبہ کہ جس سے ہم کنار ہو کے ہم سب بیری کیڈ پر آکے مل جائیں۔ اسی طرح ہو امیں لہراتی رہ۔ تو حسن اور سچائی اور نیکی کی تصویر ہے۔ تو اس آنے والے طوفان کی تنویر ہے۔ جب زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور آدمی محبت کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح یہ تینوں غنڈے مر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ فساد کے دنوں میں ہوا۔ لیکن اب وہ ہنگامہ ختم ہو چکا ہے، اب چاروں طرف سکون ہے۔

تین غنڈے

امن واماں ہے غنڈے مرچکے ہیں یا گرفتار کر کے جلیوں میں ڈال دیے گئے ہیں اور اب شہر میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے ہسپتال کے وارڈز خیموں اور لاشوں سے پٹے پٹے ہیں، اب چین ہی چین ہے۔ اب کالی رات ہے خاموشی ہے میں ہسپتال سے تھکا ماندہ آ رہا ہوں اور نہاد دھوکے کھانا کھا کے بستر کے قریب لیمپ روشن کیے دیوان پر بیٹھا ہوں اور اخبار پڑھ رہا ہوں۔ اخبار میں لکھا ہے۔ مسٹر اور مسز پھنسی اور مسٹر بندری گھر اور مسٹر ستاوان اور دوسرے معزز شہری ایک انگریزی بحری جہاز پر مدعو کئے گئے ہیں جو ساحل پر اس لیے لنگر انداز ہوا ہے تاکہ جہازی ہڑتالیوں کی بغاوت کا سدباب کر سکے۔ مسٹر بندری گجرات کے دولہا معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر پھنسی نے ایک ہلکے رنگ کی نیلی قمیص پہن رکھی ہے اور مسز پھنسی کی ساری کارنگ پگھلے ہوئے یا قوت کی طرح ہے۔ یہاں امن اور قانون اور ترقی اور دستور اور انقلاب کے جام پٹے جا رہے ہیں اور میں اخبار پھینک دیتا ہوں اور پھر رنیک سے ایک کتاب نکال کے پڑھتا ہوں۔ انسان کی تاریخ از ایچ جی۔ ویلنر اور میری پنکھوں کے سامنے بیری کیڈ ناچنے لگتے ہیں۔ آدمی نے ہزاروں سال پہلے بھی یہ بیری کیڈ بنائے تھے۔ ظلم اور جہالت اور گناہ کو مغلوب کرنے

تین غنڈے

کے لیے بیری کیڈمیری نگاہوں کے آگے نالچ ہے ہیں۔ بدرجہ محمد مسیح...
... پھر روشنی کی مشعل کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے چارلس اول کا سر نظر آتا ہے
دار پر لٹکتا ہوا۔ پیرس میں گلو تین... بمیون... اکتوبر میڈرڈ...
آج بھی بیری کیڈم کھڑے ہوئے ہیں۔

مراکش... الجزائر... مصر... ہندوستان میں...
انڈوچائنا میں... انڈونیشیا میں... یہ طوفان ہے طوفان، اسے
کون روکے گا... یہ انقلاب ہے انقلاب، اسے کون چھیرے گا۔ یہ قمیص
ہے قمیص... آدمی کی قمیص۔ ہوا میں لہراتی ہوئی۔ اسے گولیوں سے
چھلنی کر دو۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اسے بموں اور ٹینکوں سے
اڑا دو۔ یہ پھر ثابت و سالم ہو جائے گی۔ یہ قمیص مر نہیں سکتی۔ یہ آدمی
کی روح ہے!

نئی لائبریری

مشہور و مقبول معیاری اور ادبی مجموعوں کے سستے ایڈیشن

کوشن چندر	...	زندگی کے موڑ پر	افسانے
کوشن چندر	...	طاسم خیال	
کوشن چندر	...	ان داتا	
کوشن چندر	...	تین غنڈے	
کوشن چندر	...	ٹوٹے ہوئے تارے	
کوشن چندر	...	پانی کا درخت	
کوشن چندر	...	پرانے خدا	
کوشن چندر	...	جشنِ حاکت	
سعادت حسن منٹو	...	نروذ کی خدائی	
سعادت حسن منٹو	...	لذتِ سنگ	
سعادت حسن منٹو	...	مرک کے کنارے	
راجندر سنگھ بیدی	...	گر حن	
راجندر سنگھ بیدی	...	وانہ و دام	
راجندر سنگھ بیدی	...	کوکھ جلی	
راجندر سنگھ بیدی	...	بہی لڑکی	

راجندر سنگھ بیدی	...	لاہوتی	
راجندر سنگھ بیدی	...	اپنے دکھ مجھے دے دو	
ہاجو مسرور	...	ہائے اللہ	
واجدہ بتم	...	توبہ توبہ	
عصمت چغتائی	...	ایک بات	
عصمت چغتائی	...	دورخ	
اے حمید	...	منزل منزل	
محمد سلیم الرحمن	...	خلانوردوں کے افسانے	
عصمت چغتائی	...	سودائی	ناول
عصمت چغتائی	...	ٹیڑھی لکیر	
راجندر سنگھ بیدی	...	ایک چادر میلی سی	
بلونت سنگھ	...	کالے کوس	
سجاد ظہیر	...	لندن کی ایک ات	
اے حمید	...	دھوپ اور شگوفے	
کرشن چندر	...	غدار	
باری	...	تاریخ و سوانح کچھنی کی حکومت	
باری	...	کارل مارکس	
باری	...	مشیمن اور مزدور	

Pak - Luwati
 - Acc (سہ) 946-2
 First women bank Ltd
 Al-Farooq Centre
 Lancaster
 Key

باری	...	سوشلزم	تتقید
ممتاز شیریں	...	معیار	ڈرامے
سعادت حسن منٹو	...	آؤ	
کالی داس	...	شکنتلا	
اکبر الہ آبادی	...	مکتوبات اکبر	خطوط
صفیہ اختر	...	زیر لب	
صفیہ اختر	...	حرف آشنا	
غالب	...	دیران غالب	شاعری
قتیل شغالی	...	گجر	
شکیل بدایونی	...	شبستان	
ظہیر کاشمیری	...	شعری ادب	
ظفر اقبال	...	گل افق	
شاد عارفی	...	اندھیر نگری	
ساحر	...	تلخیاں	